فریب نفس یا تعبیر کی غلطی؟

کاش میں طاہر القادری صاحب سے یہ عرض کر سکتا کہ ایک اور رسوائی ان کے تعاقب میں ہے۔

یہ نفس کا فریب ہے یا تعبیر کی غلطی، یہ میں نہیں جانتا لیکن دونوں کا انجام ایک جیسا ہے، کم از کم اس دنیا کی حد تک۔ یہ سوال اس کالم نگار کے بارے میں بھی اٹھ سکتا ہے کہ یہ تجزیہ کس کا نتیجہ ہے۔تعصب کا یا بے بصیرتی کا؟ جناب طاہر القادری صاحب کا موقف تو سامنے آ چکا، میں اپنی بات کہے دیتا ہوں، فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں۔

مولانا مودودی میرے ممدوح ہیں۔علم اور اخلاق کا ایسا امتزاج کم ہی وجود میں آتا ہے۔لوگ کچھ کہتے رہیں لیکن جبہ و دستار میں لپٹے لوگوں کو بھی ان کے اخلاق کی ہوا نہیں لگی، الا ماشاء اللہ۔تاہم، میرے علم کی حد تک اس غلطی کا پہلا شکار وہی تھے۔انھوں نے اسوۂ حسنہ سے استنباط کرتے ہوئے یہ تصور پیش کیا کہ مسلمانوں کو ایک کثیر الجہت قیادت کی ضرورت ہے۔ان کی اصطلاح میں ایک ''مجدد کامل'' کی۔''مجدد کامل'' کے فرائض کیا ہیں، مولانا کے الفاظ میں:

> ''اپنے عہد میں جاہلیت کے حملے کی صحیح تشخیص اور اپنی حدود کے تحت اصلاح کی تجویز، ذہنی انقلاب کی کوشش کے ساتھ عملی اصلاح کرنا، تمدنی حالات کے تحت اجتہاد فی الدین، اسلام کو مٹانے والی سیاسی قوت کا مقابلہ، جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور پھر عالم گیر اسلامی انقلاب جس کے نتیجے میں اسلام ساری دنیا پر چھا جائے۔''

مولانا کا تجزیہ یہ ہے کہ ایسی جامع الصفات شخصیت ہماری تاریخ میں پیدا نہیں ہوئی۔''قریب تھا کہ عمر بن

عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔‘‘

مولانا کے ذہن میں وہ اسلامی انقلاب ہے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں سرزمین عرب میں برپا ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی اگر دوبارہ کوشش کی جائے گی تو اس کی حکمت عملی بھی وہی ہو گی جو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی۔ ان کے نزدیک یہ ایک منصوص معاملہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور قائد ساری ذمہ داریاں ادا فرمائیں، ان کی نیابت میں جدید اسلامی تحریک کا قائد بھی یہی کرے گا۔ ذرا ایک نظر ان اوصاف پر ایک بار پھر ڈال لیجیے جو ایک ’’مجدد کامل‘‘ میں ہونے چاہییں۔ یہ تصور پیش کرتے وقت مولانا نے اس بات سے صرف نظر کیا کہ ایک عامی اس باب میں کئی وجوہ کے سبب پیغمبر کی نیابت نہیں کر سکتا۔ پیغمبر کا علم توقیفی ہوتا ہے۔ وہ کسی کا شاگرد نہیں ہوتا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست احکام لیتا اور انھیں لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اسے صرف ونحو پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ منطق اور کلام کی۔ اسے علم تفسیر کی تحصیل کرنی ہے نہ علم حدیث کی۔ وہ تو خود صاحب وحی ہوتا ہے۔ وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے راہ نمائی لیتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی غیر پیغمبر دین کے باب میں راہ نمائی کرے گا تو اسے یہ تمام علوم سیکھنا پڑیں گے۔ ظاہر ہے یہ برسوں کا کام ہے۔ اسی طرح اگر کوئی سپہ سالار ہے تو اسے فن حرب میں مہارت حاصل کرنی ہو گی۔

اس بات کو جدید ذہن نے سمجھا ہے اور انسان نے انفرادی بصیرت سے اجتماعی بصیرت کی طرف سفر کیا ہے۔ اس نے تجربے سے یہ جانا ہے کہ ایک فرد زندگی میں کسی ایک میدان ہی کا شاہ سوار ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ایک میدان میں مہارت کے لیے بھی ایک عمر چاہیے۔ اگر ایک آدمی سب کام کرنا چاہے تو غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ یہ کام اس کے تمام تقاضے نبھاتے ہوئے کر سکے۔ مولانا مودودی خود اس کی مثال ہیں۔ انھوں نے چاہا کہ وہ علم دین، سیاست، تربیت، تنظیم اور دوسرے میدانوں میں قیادت کریں۔ اس نے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو مجروح کیا۔ یہ حادثہ اس سے پہلے ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی صورت میں دیکھ چکے ہیں۔

اس فکر میں تعبیر کی غلطی یہ ہے کہ اجتماعی بصیرت پر انفرادی بصیرت کو ترجیح دی جاتی ہے اور اس فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو ایک پیغمبر اور عامی میں ہے۔ طاہر القادری بھی یہی کر رہے ہیں۔ وہ اجتہاد فرما رہے ہیں۔ لوگوں کی تنظیم کر رہے ہیں۔ اپنے تئیں ان کا تزکیہ کر رہے ہیں، سیاست بھی کر رہے ہیں اور اب ملک میں ایک سیاسی انقلاب کے لیے میدان میں نکل چکے ہیں۔ میں تمام تر حسن ظن کے ساتھ ان کے اس تازہ اقدام کو دیکھتا ہوں تو ان کی ناکامی مجھے نوشتۂ دیوار نظر آتی ہے۔ وہ ہر میدان میں قوم کی راہ نمائی فرما رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ کسی ایک حوالے سے بھی

تاریخ کا حصہ نہیں بن پائیں گے۔ مولانا مودودی ناکامی سے دوچار ہوئے، لیکن اپنی غیر معمولی اخلاقی حیثیت کے سبب، اللہ نے ان کو رسوائی سے محفوظ رکھا۔ پروفیسر طاہر القادری کے ساتھ بدقسمتی سے ایسی داستانیں منسوب ہیں کہ ان کے بارے میں خود کو میں اس خوف سے آزاد نہیں کر سکتا۔

انسان ارتقا کے مراحل سے گزرتا ہے۔ وہ تجربات سے سیکھتا ہے۔ پروفیسر صاحب جیسے ذہین آدمی نے بہت سے تجربات کیے۔ ان کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی اخلاقی حیثیت کو کسی طرح مجروح نہ ہونے دیتے۔ دین کے حوالے سے متعارف ہونے والے لوگوں کو تو اخلاقی اعتبار سے غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس وقت وہ میدان میں نکل چکے اور اس مرحلے پر کوئی مشورہ شاید زیادہ کارگر نہ ہو۔ تاہم، نفس کا فریب یا تعبیر کی غلطی کا انجام تو بہر حال سامنے آنا ہے۔ اگر ان کے لیے ممکن ہو تو وہ کچھ دیر کے لیے اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں۔ اگر وہ خود کو تعلیم کے لیے وقف کر سکیں اور اس میں تربیت بھی شامل ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ سماج کے لیے کہیں زیادہ مفید ہو سکتے ہیں۔ خواب و خیال کی جو باتیں ان سے منسوب ہیں، میں اب انھیں دہرانا نہیں چاہتا۔ میں نے ۹۰-۱۹۸۹ء میں انھیں موضوع بنایا تھا اور اب وہ میری کتاب ''اسلام اور پاکستان'' میں بھی شامل ہیں۔ میرے نزدیک آدمی سیکھتا اور ارتقا سے گزرتا ہے۔ کاش پروفیسر طاہر القادری صاحب بھی یہ کر سکتے۔ کاش میں انھیں متنبہ کر سکتا کہ ایک اور رسوائی ان کے انتظار میں ہے۔

فقیہِ شہر کی تحقیر کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

——— خورشید احمد ندیم

غیر مسلموں کا اسلامی سزا کے لیے مطالبہ

۱۶ دسمبر ۲۰۱۲ء کی رات دہلی میں ایک بس میں ۲۳ سالہ لڑکی کی اجتماعی عصمت دری اور پھر زخموں کی تاب نہ لا کر اس کے انتقال کر جانے کے واقعہ نے پورے بھارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ بھارتی وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے استعفے پیش کر دیے۔ بھارتی خواتین میں اسلحہ حاصل کرنے کی درخواستوں میں اضافہ ہو گیا۔ بس میں اس لڑکی کا

دوست بھی سوار تھا جس نے دفاع میں مزاحمت کی، مگر مجرموں نے اس کو بھی زخمی کر دیا تھا۔اس دوست نے صحت یاب ہوکر مطالبہ کیا ہے کہ مجرموں کو زندہ جلا دیا جائے۔ بھارتی حکومت نے زیادتی کے خلاف قانون کو مزید سخت کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے تمام سیاسی جماعتوں سے تجاویز مانگ لیں۔اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بانکی مون نے بھی حکومت بھارت سے سخت سے سخت سزا کا مطالبہ کیا ہے۔حکمران جماعت کی سربراہ سونیا گاندھی نے کہا کہ ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ مجرموں کو سخت سے سخت سزا ملے۔ احتجاج کرنے والوں نے جنسی زیادتی کی سزا میں اضافے کا مطالبہ کیا ہے۔شو بز سے وابستہ خواتین نے بڑے قابل غور مطالبات کیے۔انھوں نے کہا کہ اگر واقعی تبدیلی لانی ہے تو قانون میں تبدیلی لانی ہوگی۔.....مجرموں کو نامرد بنا دیا جائے........مجرموں کو سرعام سنگ سار کر دیا جائے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اجتماعی عصمت دری کی سزا پر غیر مسلم اور لبرل حتیٰ کہ فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ عام سزاے موت پر مطمئن نہیں ہو رہے۔وہ سزاے موت سے زیادہ سخت سزا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔وہ مجرموں کی سزا قتل کے بجاے تقتیل چاہ رہے ہیں۔بالفاظ دیگر وہ اصل میں ایک اسلامی سزا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

انسان خیر وشر، دونوں قسم کے جذبات رکھتا ہے۔وہ شر کی راہ اختیار نہ کرے، وہ دوسرے انسان کی جان، مال اور آبرو کے لیے خطرہ نہ بنے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص ہدایت کا اہتمام کیا، یعنی کچھ جرائم کی سزا خود مقرر کر دی۔ یہ ایسے جرائم ہیں کہ اس معاملے میں انسان اگر خود کوئی قانون سازی کرتا تو وہ ٹھوکر کھا سکتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بعض جرائم کی سزا قتل اور تقتیل مقرر کر دی۔سورہ مائدہ (۵) کی آیت ۳۳ میں ہے:

''ان لوگوں کی سزا، جو اللہ اور رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں، بس یہ ہے کہ تقتیل (عبرت ناک طور پر قتل) کر دیے جائیں یا سولی پر لٹکا دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔''

ملک میں فساد برپا کرنے کے حوالے سے صاحب تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی نے شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے۔اپنے شر وفساد سے علاقے کے امن ونظم کو درہم برہم کر دے۔ لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، تہریب، اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لا اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔'' (۲/۵۰۵)

پھر اصلاحی صاحب تقتیل کی وضاحت کرتے ہیں:

''عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق ملے۔ صرف وہ طریقہ اس سے مستثنیٰ ہوگا جو شریعت میں ممنوع ہے۔ مثلاً آگ میں جلانا، اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو گنڈوں اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون و نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک 'تقتیل' کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ گنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کے عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائیں، جو اغوا اور زنا کو پیشہ بنا لیں، جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکے ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں، ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔'' (۵۰۶/۲)

لاریب، جب کچھ انسان نما درندے کھلم کھلا کسی نوخیز لڑکی کو زیادتی کا نشانہ بنا کر اسے قتل کر دیتے ہیں یا اسے قتل نہ بھی کریں تب بھی ایسے مجرموں کی سزا تقتیل ہی ہونی چاہیے۔ اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ کہنے والے مسلمانوں سے بس اتنی درخواست ہے کہ وہ مجرموں کے ساتھ محبت کو اپنے دل سے چند لمحوں کے لیے نکال کر تھوڑی دیر کے لیے زیادتی کا شکار ہونے والی لڑکی، اس کی ماں، اس کی بہن، اس کے باپ، اس کے بھائی کے لیے کچھ ہمدردی پیدا کر کے یا اس خاتون کی جگہ اپنی بیٹی، بہن یا بیوی کو رکھ کر سوچیں تو ان ''وحشیانہ'' سزاؤں سے بڑی عادلانہ سزا انھیں اور کوئی سجھائی نہیں دے گی۔ جب صحیح زاویۂ نگاہ سے غیر مسلم فلمی اداکارائیں بھی سوچتی ہیں تو وہ بھی صحیح رائے تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس لیے اپنے لوگوں کے صحیح رائے تک پہنچنے کے امکانات ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اپنے اندر مظلوم کے ساتھ ہمدردی اور مجرم سے بیزاری پیدا کر کے سوچا جائے۔ یہی ''وحشیانہ'' سزائیں ہیں جو ان انسانوں کو بھی انسانی حدود میں رکھ سکتی ہیں جن کے اندر وحشی بننے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ دیدۂ بینا رکھنے والا ہر شخص صاف دیکھ سکتا ہے کہ انھی سزاؤں میں اصل میں معاشرے کا حسن اور سکون پوشیدہ ہے۔

اب اس مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ بھارت میں اس واقعہ پر فلمی فنکاروں نے بے حد دکھ کا اظہار کیا۔ بعض فنکاروں کی اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آنکھیں بھیگ گئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھارت میں یہ تنقید بھی کی گئی ہے کہ بھارتی فلمیں بھی ایسے واقعات کی ذمہ دار ہیں۔ یہ تنقید قابل توجہ ہے۔ بھارتی فلمی لوگوں کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ بھارتی فلمیں پورے برصغیر کو متاثر کر رہی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ بہت سے لوگ فلمیں دیکھ کر جرائم کرنا سیکھتے ہیں۔ سادہ لوح نوجوان فلمی اداکاروں کی نقل کرتے ہیں۔ ان کے لباس پہننے، بال

بنانے، بات کرنے حتیٰ کہ چلنے کے انداز کی بھی نقل کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بھارتی فلموں میں نفسانی جذبات کو ابھارنے والے مناظر میں خوف ناک حد تک اضافہ ہو چکا ہے۔ فلمیں بنانے والے عام طور پر اصل میں entertainers ہوتے ہیں یعنی دلوں کو لبھانے والے ہیں، مگر انھیں اس پر سنجیدگی سے سوچنا ہو گا کہ وہ لوگوں کے دلوں کو لبھاتے لبھاتے، انھیں آلودہ کرنے کا باعث تو نہیں بن رہے۔ کیونکہ دلوں کی یہی آلودگی ہوتی ہے جو بعض اوقات شدت اختیار کر لیتی ہے اور پھر دلی ریپ جیسے ہولناک واقعات کی بالواسطہ وجہ بن جاتی ہے۔

—— محمد بلال

محترمی و مکرمی قارئین......

۱۔ اشراق کے اجراء کے لیے

۲۔ اشراق نہ ملنے کی صورت میں

درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ کریں:

ishraq@javedahmadghamidi.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ التوبہ

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَالَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ

ایمان[۱۹۲] والو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو زمین پر ڈھیر ہوئے جاتے ہو[۱۹۳]۔ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ (حقیقت

۱۹۲؎ یہ چوتھا شذرہ ہے اور ۹ھ ہجری میں کسی وقت نازل ہوا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے خلاف اعلان جنگ کے بعد یہاں سے روے سخن اب منافقین کی طرف ہے اور سورہ کے آخر تک اُنھی کا تعاقب فرمایا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...اِس سے پہلے منافقین کے رویے پر جو تنقید بھی ہوئی، اُس کا لب و لہجہ نرم رہا ہے، لیکن اِس سورہ میں جس طرح مشرکین اور اہل کتاب کے باب میں آخری فیصلے کا اعلان کر دیا گیا ہے، اُسی طرح منافقین کے بارے میں بھی ایک قطعی فیصلہ سنا دیا گیا ہے تاکہ اُن میں سے جن کے اندر توبہ اور اصلاح کی کوئی صلاحیت باقی ہے، وہ توبہ اور اصلاح کے لیے اسلامی معاشرے کے صالح جزو بن جائیں اور جو بالکل مردہ ہو چکے ہیں، وہ خس و خاشاک کے

اِلَّا قَلِيۡلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَلَا
تَضُرُّوۡهُ شَيۡـًٔا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ
اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِى الۡغَارِ اِذۡ يَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيۡنَ

یہ ہے کہ) آخرت میں تو دنیا کی زندگی کا یہ سروسامان بہت تھوڑا نکلے گا۔(اِس لیے اٹھو)، اگر نہیں اٹھو گے تو (یاد رکھو کہ) خدا تمھیں دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔[۱۹۴] خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۱۹۵] اگر تم پیغمبر کی مدد نہیں کرو گے (تو کچھ پروا نہیں)، اُس کی مدد تو اللہ نے اُس وقت فرمائی، جب اِنھی منکروں نے اُس کو اِس طرح نکالا تھا کہ وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا،[۱۹۶] جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو،

اُس ڈھیر میں شامل ہو جائیں جس کے صاف کر دینے کا آخری فیصلہ قدرت کی طرف سے ہو چکا ہے۔‘‘

(تدبرقرآن ۳/ ۵۷۲)

۱۹۳؎ اصل الفاظ ہیں: ’اِثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ‘۔ اِن میں، اگر غور کیجیے تو قرآن نے اُس حالت کی تصویر کھینچ دی ہے جسے بیان کرنا مقصود ہے۔

۱۹۴؎ یہ اُن لوگوں کی سزا ہے جنھیں خدا اپنے کسی مشن کے لیے منتخب کر لے اور وہ اُس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے انکار کر دیں۔ ذریت ابراہیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہمیشہ رہا ہے، وہ اِسی قانون کے تحت ہے۔

۱۹۵؎ یہ مختصر سا جملہ بہ یک وقت کئی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

’’...ایک یہ کہ خدا تمھیں عذاب دینے پر قادر ہے، دوسری یہ کہ تمھاری جگہ دوسروں کو اٹھا کھڑا کرنے پر قادر ہے، تیسری یہ کہ وہ اپنی ہر اسکیم بروے کار لانے پر قادر ہے، اپنے کسی بھی ارادے کی تکمیل میں وہ کسی کا محتاج نہیں۔‘‘

(تدبرقرآن ۳/ ۵۷۶)

۱۹۶؎ یہ سفر ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس میں صرف سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔

كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾
اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ
وَلٰكِنْ م بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ

اللہ ہمارے ساتھ ہے[۱۹۷]۔ اللہ نے اُس وقت اُس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکروں سے اُس کی مدد کی جو تم کو نظر نہیں آئے اور منکروں کی بات اُس نے نیچی کر دی اور خدا کی بات ہی اونچی رہی۔ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے[۱۹۸]۔ ۳۸-۴۰

تم نکلو، خواہ تم ہلکے ہو یا بوجھل، اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو[۱۹۹]۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ (اے پیغمبر)، اگر فائدہ نزدیک اور سفر ہلکا ہوتا تو یہ لوگ ضرور تمھارے پیچھے ہو لیتے، مگر یہ منزل اِن پر کٹھن ہو گئی[۲۰۰]۔ اب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم نکل سکتے تو ضرور

۱۹۷؎ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس اندیشے سے کہ آپ کا تعاقب کیا جائے گا، مکہ سے نکل کر تین دن کے لیے غار ثور میں پناہ گیر ہو گئے تھے۔ یہ اُسی موقع کا ذکر ہے۔ آپ کا تعاقب کرنے والے عین اُس غار کے دہانے تک پہنچ گئے تھے جس میں آپ چھپے ہوئے تھے۔ سیدنا ابوبکر کو سخت خوف لاحق ہوا کہ کہیں کوئی شخص آگے بڑھ کر غار میں جھانک نہ لے، لیکن آپ کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا اور اپنے ساتھی کی تسلی کے لیے آپ کی زبان مبارک سے وہ بے مثل الفاظ نکلے جو قرآن نے یہاں نقل کیے ہیں*۔

۱۹۸؎ یہ بالا جمال اُن سب تائیدات الٰہی کا حوالہ ہے جو اُس وقت تک ظاہر ہو چکی تھیں۔

۱۹۹؎ یعنی سروسامان کم ہو یا زیادہ، اُسے جہاد سے جی چرانے کا بہانہ نہ بناؤ۔ یہ نفیر عام کا موقع ہے۔ اِس نوعیت کا کوئی عذر بھی اِس وقت مقبول نہیں ہے۔

۲۰۰؎ یعنی تبوک کا سفر جس میں روم جیسی بڑی اور منظّم طاقت سے مقابلہ تھا، مسافت طویل تھی، موسم شدید گرم تھا اور نئے سال کی فصل پک کر کٹنے کے لیے تیار ہو چکی تھی**۔

* السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۲/۱۱۱۔

يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۴۲﴾

تمھارے ساتھ نکلتے۔ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں[۲۰۱]۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۴۱-۴۲

۲۰۱؎ اللہ اور اُس کے رسول کے سامنے جھوٹے عذرات پیش کیے جائیں تو اُس کا نتیجہ، ظاہر ہے کہ یہی ہے اور یہی ہونا چاہیے۔

[باقی]

''... مسلمانوں کے لیے اللہ کا وعدۂ نصرت غیر مشروط نہیں ہے کہ وہ جو رویہ بھی چاہیں اختیار کریں لیکن خدا کی نصرت ہر حال میں ان کے ہم رکاب ہی رہے، بلکہ یہ مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ مسلمان ادائے فرض میں ڈھیلے نہ پڑیں، اطاعت امر میں اختلاف نہ کریں، خدا اور رسول کی نافرمانی نہ کریں، آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے طالب نہ بنیں۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۱۹۳)

** السیرۃ النبویہ، ابن ہشام ۴/ ۱۳۱۔

معز امجد
ترجمہ: شاہد رضا

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے لڑوں''

روی أنه قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: أمرت أن أقاتل الناس حتی یشهدوا أن لا إله إلا اللّٰہ وأن محمدًا رسول اللّٰہ ویقیموا الصلٰوۃ ویؤتوا الزکوۃ، فإذا فعلوا ذلك عصموا منی دماء هم وأموالهم إلا بحق الإسلام، لهم ما للمسلمین وعلیهم ما علی المسلمین، وحسابهم علی اللّٰہ.

روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے لڑوں[1]، یہاں تک کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں[2]۔ اگر وہ یہ کریں گے تو ان کی زندگی اور مال مجھ سے محفوظ ہیں[3]، اسلام کی طرف سے دیے گئے کسی حق کے سوا[4]۔ (ان شرائط کو پورا کرنے کی صورت میں ان کو مسلم تصور کیا جائے گا) اور وہ تمام حقوق جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہوں گے، ان کو بھی حاصل ہوں گے اور جو فرائض دیگر مسلمانوں پر عائد ہوں گے، وہی ان پر عائد ہوں گے[5]، اور ان کے اعمال کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ان سے مراد بنی اسمٰعیل کے مشرکین ہیں۔اس نکتے کی تصدیق ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں لفظ 'الناس '(یہ لوگ) کے بجائے لفظ 'المشر کین '(یہ مشرکین) آیا ہے۔اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ،جن مشرکین کی طرف رسول بھیجا گیا،اگر وہ رسول کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو وہ سزائے موت کے مستحق ہیں۔ یہ سزائے موت دو الگ طریقوں سے دی جا سکتی ہے:

ا۔رسول کے سیاسی حالات کے پیش نظر۔

ب۔رسول کے ماننے والوں کی تلواروں کے ذریعے سے۔

اگر رسول کو کسی خطۂ زمین میں سیاسی اقتدار نہ دیا جائے تو یہ فیصلہ براہ راست قدرتی آفات،یعنی بگولوں،زلزلوں اور سیلابوں کی صورت میں صادر ہوتا ہے،جیسا کہ حضرت ہود،حضرت شعیب اور حضرت نوح علیہم السلام وغیرہ کے مخاطبین کے معاملے میں ہوا تھا۔اس کے برعکس،اگر رسول کو کسی خطۂ زمین میں سیاسی اقتدار دیا جائے تو یہ سزا اس کے ماننے والوں کی تلواروں کے ذریعے سے صادر ہوتی ہے،جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تھا۔اس سزائے موت کے صادر ہونے میں فرق کا سبب کیا ہے؟اس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ. وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ.

(التوبہ۹: ۱۴-۱۶)

''ان سے لڑو،اللہ تعالیٰ ان کو تمھارے ہاتھوں کے ذریعے سے سزا دے گا،وہ ان کو رسوا کرے گا اور تم کو ان پر فتح دے گا اور (اس طرح) ماننے والوں کے سینوں کو سکون بخشے گا اور ان کے دلوں سے غصے کو ختم کر دے گا۔(یاد رکھو،اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے،سزا دیتا ہے) اور اللہ تعالیٰ (اپنے علم وحکمت کے مطابق) جس پر چاہتا ہے،رحم کرتا ہے۔یقیناً اللہ تعالیٰ علم اور حکمت والا ہے۔کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیے جاؤ گے،حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ان لوگوں کو الگ نہیں کیا جنھوں نے تم میں سے

(اپنے طریقے پر) جہاد کیا اور جنھوں نے اللہ تعالیٰ،
اس کے رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی کو دوست نہیں
بنایا؟ اور جو تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے
والا ہے۔''

۲۔ بعض روایات میں معافی کے لیے بعض شرائط کا اضافہ ہے۔ مثلاً ترمذی، رقم ۲۶۰۸ میں ان شرائط میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان، نماز پڑھنا، زکوٰۃ ادا کرنا، نماز کے لیے مسلمانوں کے قبلہ کی طرف منہ کرنا اور مسلمانوں کے ذبح کردہ جانوروں کو کھانا شامل ہیں۔ اولاً، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ترمذی کی روایت میں مذکورہ دو اضافی شرائط اوپر متن میں مذکورہ شرائط کی صرف وضاحت کے لیے آئی ہیں۔ مسلمانوں کے قبلہ کی طرف منہ کرنا، اصل میں، نماز قائم کرنے کی وضاحت ہے۔ مسلمانوں کے ذبح کردہ جانوروں کو کھانا، اصل میں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کی وضاحت ہے، جس سے یہ بات بالبداہت واضح ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی پوری اطاعت کی جائے اور اس کو خلوص دل سے قبول کیا جائے۔ ثانیاً، قرآن مجید نے سزائے موت سے معافی دینے کے متعلق عقائد کی اصلاح کے علاوہ دو قابل مشاہدہ احکام بیان کیے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ. (التوبہ ۹: ۵)

''چنانچہ تم ان مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ، قتل کر دو، ان کو پکڑو، ان کا محاصرہ کرو اور ان کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ (اپنے مشرکانہ عقائد اور پیغمبر کے انکار سے) باز آ جائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

۳۔ اس لیے اگر وہ یہ شرائط پوری کریں تو سزائے الٰہی سے ان کو معافی دی جائے گی۔

۴۔ اس لیے ان کی زندگی اور مال کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی، سوائے اس کے کہ وہ ایسے جرم کے مرتکب ہوئے ہوں جس کے لیے اسلام نے جسمانی یا مالی جرمانے کی صورت میں کوئی سزا مقرر کی ہے۔

۵۔ اس لیے سزائے الٰہی سے معافی کے لیے اگر وہ مذکورہ شرائط پوری کریں گے، تو اس سے نہ صرف وہ سزائے الٰہی سے محفوظ رہیں گے، بلکہ ان کو مسلمانوں جیسا قانونی اور معاشرتی درجہ بھی ملے گا، ان کو وہ تمام حقوق ملیں

گے جو حکومت نے مسلمانوں کو دیے ہیں اور ان پر وہی فرائض عائد کیے جائیں گے جو دیگر مسلمانوں پر عائد کیے جائیں گے۔ یہ بھی قرآن مجید کے ایک واضح حکم پر مبنی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ. (التوبہ ۹: ۱۱)

''پھر اگر وہ (اپنے مشرکانہ عقائد اور پیغمبر کے انکار سے) باز آجائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، تو پھر وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔''

۶۔ اس لیے دنیوی زندگی کے مقاصد، حکومت کی طرف سے دیے گئے حقوق کے مقاصد اور حکومت کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی کے لیے اس کے اور دیگر مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہوگا، یہاں تک کہ اس کے خفیہ ارادوں، اس کے اخلاص اور دعوت اسلام کی قبولیت کا فیصلہ بھی سب کچھ جاننے والا اللہ تعالیٰ ہی کرے گا، اور اسی کے مطابق اس کو انعام یا سزا ملے گی۔

متون

یہ حدیث بعض اختلافات کے ساتھ درج ذیل مقامات میں روایت کی گئی ہے:

بخاری، رقم ۲۵، ۳۸۵، ۱۳۳۵، ۲۷۸۶، ۶۵۲۶، ۶۸۵۵؛ مسلم، رقم ۲۰، ۱۲۱، ۲۱ب، ۲۱ج، ۲۲، ۱۲۳، ۲۳ب؛ ترمذی، رقم ۲۶۰۶-۲۶۰۸، ۳۳۴۱؛ ابوداؤد، رقم ۱۵۵۶-۱۵۵۷، ۲۶۳۰، ۲۶۴۰-۲۶۴۲؛ نسائی، رقم ۲۴۴۳، ۳۰۹۰-۳۰۹۵، ۳۹۶۶-۳۹۸۳، ۵۰۰۳؛ ابن ماجہ، رقم ۷۱-۷۲، ۳۹۲۷-۳۹۲۹؛ احمد، رقم ۶۷، ۸۱۴۸، ۸۵۲۵، ۸۸۹۱، ۹۴۶۹، ۹۶۵۹۸، ۱۰۱۶۱-۱۰۱۶۲، ۱۰۲۵۹، ۱۰۸۳۴، ۱۰۸۵۲، ۱۳۰۷۸، ۱۳۳۷۲، ۱۴۱۷۴، ۱۴۲۴۷، ۱۴۶۰۰، ۱۴۶۹۱، ۱۵۲۷۸، ۱۶۲۰۵، ۱۶۲۰۸؛ دارمی، رقم ۲۴۴۶؛ ابن حبان، رقم ۱۷۴-۱۷۵، ۲۱۶-۲۲۰، ۵۸۹۵؛ بیہقی، رقم ۲۰۳۱، ۴۹۱۹-۴۹۲۱، ۶۲۹۳، ۱۱۶۷، ۱۲۹۷، ۱۲۷۱۰، ۱۲۸۹۴، ۱۲۸۹۸-۱۲۸۹۹، ۱۵۰۴۷، ۱۵۶۲۳، ۱۶۲۸۰، ۱۶۵۰۷-۱۶۵۰۸، ۱۶۵۱۰-۱۶۵۱۲، ۱۶۶۰۴-۱۶۶۰۵، ۱۷۷۲۶، ۱۸۴۰۴-۱۸۴۰۵، ۱۸۴۰۵۱؛ ابن خزیمہ، رقم ۲۲۴۷۔۲۲۴۸؛ سنن النسائی الکبریٰ، رقم ۲۲۲۳، ۳۴۲۸-۳۴۴۲، ۳۴۴۴-۳۴۴۵، ۴۲۹۸-۴۳۰۳، ۸۶۸۰، ۱۱۶۷۰، ۱۱۷۳۴، ۱۶۵۰۷-۱۶۵۰۹، ۱۸۴۰۷؛ ابویعلیٰ، رقم ۶۸، ۲۲۸۲، ۶۱۳۴؛ مصنف عبدالرزاق، رقم ۶۹۱۶۔

بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۹۷۸ میں 'أمرت أن أقاتل الناس' (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے

لڑوں) کے الفاظ کے بجائے ’نقاتل الناس‘ (ہم ان لوگوں سے لڑیں گے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۱۴۱۷۴ میں یہ الفاظ ’أقاتل الناس‘ (میں ان لوگوں سے لڑوں گا) روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۱۰۲۵۰ میں یہ الفاظ ’لا أزال أقاتل الناس‘ (میں ان لوگوں سے لڑتا رہوں گا) روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً ابویعلیٰ، رقم ۶۱۳۴ میں یہ الفاظ ’قاتلوا الناس‘ ((مسلمانو)، ان لوگوں سے لڑو) روایت کیے گئے ہیں، جبکہ بعض روایات، مثلاً ابوداؤد، رقم ۲۶۳۲ میں یہ الفاظ ’أمرت أن أقاتل المشرکين‘ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان مشرکین سے لڑوں) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۲۷۸۶ میں ’ويقيموا الصلوة ويؤتوا الزكوة‘ (اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں) کے الفاظ محذوف ہیں۔ چنانچہ ’حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمدًا رسول الله ويقيموا الصلوة ويؤتوا الزكوة‘ (یہاں تک کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں) کے بجائے ’حتى يقول لا إله إلا الله‘ (یہاں تک کہ یہ لوگ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۲۱ب میں ’حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله ويؤمنوا بی وبما جئت به‘ (یہاں تک کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ مجھ پر اور (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) جو کچھ میں لے کر آیا ہوں، اس پر ایمان لائیں) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً ابن حبان، رقم ۲۲۰ میں یہ الفاظ ’حتى يقولوا لا إله إلا الله وآمنوا بی وبما جئت به‘ (یہاں تک کہ وہ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ مجھ پر اور (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) جو کچھ میں لے کر آیا ہوں، اس پر ایمان لائیں) روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً ابن ماجہ، رقم ۷۱ میں یہ الفاظ ’حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأنی رسول الله‘ (یہاں تک کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں) روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً بیہقی، رقم ۱۲۸۹۸ میں یہ الفاظ ’حتى يقولوا لا إله إلا الله ويقيموا الصلوة ويؤتوا الزكوة‘ (یہاں تک کہ وہ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں) روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۲۶۰۸ میں یہ الفاظ ’حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمدًا عبده ورسوله وأن يستقبلوا قبلتنا ويأكلوا ذبيحتنا وأن يصلوا صلاتنا‘ (یہاں

تک کہ وہ اس بات کا اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں اور یہ کہ ہمارے قبلہ (کعبہ) کی طرف منہ کریں اور ہمارے ذبیحہ کو کھائیں اور ہماری طرح نماز ادا کریں) روایت کیے گئے ہیں، جبکہ بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۳۸۵ میں یہ الفاظ 'حتی یقولوا لا إله إلا اللّٰه فإذا قالوها و صلوا صلاتنا و استقبلوا قبلتنا و ذبحوا ذبيحتنا' (یہاں تک کہ وہ اس بات کا اقرار کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، چنانچہ جب وہ اس بات کا اقرار کر لیں اور ہماری طرح نماز ادا کریں اور ہمارے قبلہ (کعبہ) کی طرف منہ کریں اور ہماری طرح جانور ذبح کریں) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۹۸۳ میں 'فإذا فعلوا ذلك' (اگر وہ یہ چیزیں کریں) کے الفاظ محذوف ہیں۔ بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۲۷۸۶ میں 'فإذا فعلوا ذلك' (اگر وہ یہ چیزیں کریں) کے بجائے 'فمن قال لا إله إلا اللّٰه' (جس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۲۱ ج میں ان الفاظ کے بجائے 'فإذا قالوا لا إله إلا اللّٰه' (اگر وہ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً ابن حبان، رقم ۱۷۴ میں ان الفاظ کے بجائے 'فإذا شهدوا أن لا إله إلا اللّٰه و آمنوا بی و بما جئت به' (اگر وہ اس بات کا اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور مجھ پر اور (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) جو کچھ میں لے کر آیا ہوں، اس پر ایمان لائیں) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً ترمذی، رقم ۲۶۰۶ میں یہ الفاظ 'فإذا قالوها' (اگر وہ یہ کہیں) روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۰۹۵ میں ان الفاظ کے بجائے 'فمن قالها' (جو یہ کہے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۹۶۶ میں یہ الفاظ 'فإذا شهدوا أن لا إله إلا اللّٰه و أن محمدًا عبده و رسوله و صلوا صلاتنا و استقبلوا قبلتنا و أكلوا ذبائحنا' (اگر وہ اس بات کا اعلان کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں اور ہماری طرح نماز ادا کریں اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کریں اور ہمارے ذبیحہ کو کھائیں) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۲۷۸۶ میں 'فإذا فعلوا ذلك' (اگر وہ یہ چیزیں کریں) کے الفاظ کے بعد 'فقد' (تو) کے لفظ کا اضافہ ہے۔

بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۱۰۸۳۴ میں 'عصموا منی دماء هم و أموالهم إلا بحق الإسلام' (ان

کی زندگی اوران کا مال مجھ سے محفوظ ہے،سوائے اسلام کے کسی حق کے) کے الفاظ محذوف ہیں۔

بعض روایات،مثلاً بخاری،رقم ۲۷۸۶ میں'عصموا مني'(وہ مجھ سے محفوظ ہیں) کے الفاظ کے بجائے'عصم مني'(وہ مجھ سے محفوظ ہے) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔بعض روایات،مثلاً ترمذی،رقم ۲۶۰۶ میں اس جملے کے بجائے'منعوا مني'(وہ مجھ سے روک دیے گئے) کا جملہ روایت کیا گیا ہے۔بعض روایات،مثلاً نسائی،رقم ۳۹۷۸ میں اس جملے کے بجائے'حرمت علینا'(ہم پرحرام ہے) کا جملہ روایت کیا گیا ہے۔بعض روایات،مثلاً نسائی،رقم ۳۹۸۳ میں اس جملے کے بجائے'ثم تحرم'(پھروہ حرام کردیے گئے) کا جملہ روایت کیا گیا ہے۔بعض روایات،مثلاً احمد،رقم ۱۴۶۹۱ میں اس جملے کے بجائے'حرمت علي'(یہ مجھ پرحرام ہے) کا جملہ روایت کیا گیا ہے۔بعض روایات،مثلاً ابویعلیٰ،رقم ۶۱۳۴ میں اس جملے کے بجائے'حقنوا'(روک دیے گئے) کا لفظ روایت کیا گیا ہے۔بعض روایات،مثلاً ابن ماجہ،رقم ۳۹۲۹ میں اس جملے کے بجائے'حرم علي'(یہ مجھ پرحرام ہے) کا جملہ روایت کیا گیا ہے۔بعض روایات،مثلاً بیہقی،رقم ۱۲۸۹۸ میں اس جملے کے بجائے'حرمت'(یہ حرام ہے) کا جملہ روایت کیا گیا ہے۔

بعض روایات،مثلاً احمد،رقم ۱۴۶۰۰ میں'دماء هم وأموالهم'(ان کے خون اور مال) کے بعد'أنفسهم'(ان کی زندگیاں) کا اضافہ کیا گیا ہے۔

بعض روایات،مثلاً بخاری،رقم ۲۷۸۶ میں'دماء هم'(ان کے خون) کے بجائے'نفسه'(اس کی زندگی) کا لفظ روایت کیا گیا ہے۔

بعض روایات،مثلاً بخاری،رقم ۲۷۸۶ میں'أموالهم'(ان کے اموال) کے بجائے'ماله'(اس کا مال) کا لفظ روایت کیا گیا ہے۔

بعض روایات،مثلاً بخاری،رقم ۲۷۸۶ میں'إلا بحق الإسلام'(سوائے اسلام کے کسی حق کے) کے بجائے'إلا بحقه'(سوائے اس کے کسی حق کے) کا جملہ روایت کیا گیا ہے۔بعض روایات،مثلاً احمد،رقم ۸۸۹۱ میں یہ الفاظ'إلا من أمر حق'(سوائے کسی سبب کے لیے جو کہ عدل ہے) روایت کیے گئے ہیں۔

'لهم ما للمسلمین وعلیهم ما علی المسلمین'(وہ تمام حقوق جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہوں گے، ان کو بھی حاصل ہوں گے اور جو فرائض دیگر مسلمانوں پر عائد ہوں گے، وہی ان پر عائد ہوں گے) کے الفاظ ترمذی، رقم ۲۶۰۸ میں روایت کیے گئے ہیں۔بعض روایات،مثلاً بخاری،رقم ۳۸۵ میں یہ الفاظ'فهو المسلم، له ما

للمسلم وعلیه ما علی المسلم '(وہ ایک مسلمان ہے، وہ تمام حقوق جو دوسرے مسلمان کو حاصل ہوں گے، اس کو بھی حاصل ہوں گے اور جو فرائض دوسرے مسلمان پر عائد ہوں گے، اس پر وہی فرائض عائد ہوں گے) روایت کیے گئے ہیں۔ بعض روایات، مثلاً نسائی، رقم ۳۹۶۷ میں یہ الفاظ 'لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علیھم '(وہ تمام حقوق جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہوں گے، ان کو بھی حاصل ہوں گے اور جو فرائض دیگر مسلمانوں پر عائد ہوں گے، وہی ان پر عائد ہوں گے) روایت کیے گئے ہیں۔

بعض روایات، مثلاً احمد، رقم ۱۴۶۹۱ میں 'وحسابھم علی اللّٰہ '(اور ان کے اعمال کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے) کے جملے کے بجائے 'وعلی اللّٰہ حسابھم '(اور اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے ان کے اعمال کا حساب) کا جملہ روایت کیا گیا ہے، جبکہ بعض روایات، مثلاً بخاری، رقم ۲۷۸۶ میں یہ جملہ 'وحسابه علی اللّٰہ '(اور اس کے اعمال کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے) روایت کیا گیا ہے۔

بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۲۱ج میں راوی نے 'ثم قرأ: اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ '، ''پھر آپ نے تلاوت کی: آپ ان کو صرف یاددہانی کرانے والے ہیں، آپ ان پر کوئی محافظ نہیں ہیں'' (الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲) کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔

بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۱۲۳ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ قدرے مختلف روایت کیے گئے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

من قال لا إله إلا اللّٰہ و کفر بما یعبد من دون اللّٰہ حرم ماله ودمه وحسابه علی اللّٰہ.

''جو یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس کی پوجا کرتا تھا، اس کا انکار کیا، تو اس کا مال اور خون حرام ہو گیا اور اس کے اعمال کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔''

بعض روایات، مثلاً مسلم، رقم ۲۳ب میں 'من قال لا إله إلا اللّٰہ '(جس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے) کے الفاظ کے بجائے 'من وحد اللّٰہ '(جس نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان کیا) کے الفاظ روایت کیے گئے ہیں۔

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت یاسر رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت یاسر عنسی رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عامر اور دادا کا مالک تھا۔ان کا شجرۂ نسب یعرب بن قحطان سے جا ملتا ہے جو ایک قول کے مطابق اس دنیا میں عربی بولنے والے پہلے شخص تھے، دوسری راے میں یہ شرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کو حاصل ہے۔یعرب یمن کے تمام عرب قبائل کے جد اعلیٰ ہیں،ان کی دسویں نسل میں زید بن مالک (مذحج) ہوئے جو اپنے لقب عنس سے مشہور ہیں۔انھی کے نام سے قبیلۂ عنس منسوب ہوا جس میں حضرت یاسر پیدا ہوئے۔شہر سبا کے اجڑنے کے بعد عنس اور خزرج قبائل یثرب (مدینہ) میں آ بسے، جبکہ دوسرے یمنی قبائل شام، عراق، یمامہ اور نجد کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔مکہ ہر دور میں بے سہارا لوگوں کی جاے پناہ رہا ہے، بیت اللہ کی موجودگی کی وجہ سے یہ امن کا گہوارا تھا۔یہی وجہ ہے کہ یمن کے خراب حالات اور خشک سالی کے باعث حضرت یاسر کا ایک بھائی اپنے کئی ہم وطنوں کی طرح گھر سے بھاگ نکلا تو انھوں نے اس کا کھوج لگانے کے لیے مکہ کا رخ کیا۔ان کے دو دوسرے بھائی حارث اور مالک ان کے ساتھ تھے۔بھائی نہ ملا تو وہ دونوں تو مایوس ہو کر وطن واپس چلے گئے، لیکن حضرت یاسر کو مکہ ایسا بھایا کہ وہیں بس گئے۔انھوں نے قبائلی رواج کے مطابق ابوجہل کے چچا مہشم بن مغیرہ مخزومی کے ساتھ جینے مرنے کا حلف اٹھا لیا۔مہشم جو اپنی کنیت ابوحذیفہ سے مشہور ہیں، اپنے قبیلے بنومخزوم کے معزز سردار تھے۔انھوں نے حضرت یاسر کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کیا،حضرت یاسر بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔کچھ وقت گزرا تو انھوں نے بنولخم سے تعلق رکھنے والی اپنی باندی سمیہ بنت خباط (یا خیاط) سے حضرت یاسر کی شادی کر دی۔

۵۷۰ء، عام الفیل (دوسری روایت: ۵۶۶ء) میں حضرت یاسر کے ہاں عمار کی ولادت ہوئی، یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا سال ہے۔ ان کے دو بیٹے اور ہوئے، عبداللہ (یا عبود) اور حریث (یا حویرث)، مابین القوسین تحریر کردہ نام شارح سیرت ابن ہشام، سہیلی نے لکھے ہیں۔ حضرت یاسر کی کنیت ابوعمار تھی۔ تاریخ میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ ابوحذیفہ نے یاسر اور عمار کو آزاد کر دیا، لیکن اس ضمن میں سمیہ کا نام نہیں لیا گیا۔ حضرت یاسر کا کنبہ آخری وقت تک ابوحذیفہ کے ساتھ رہا۔ ابوحذیفہ کی وفات بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہوئی۔ حریث کو دور جاہلیت میں بنو دیل نے قتل کر دیا۔

بعثت سے قبل بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت یاسر کے کنبہ سے قریبی تعلقات تھے۔ سیدنا ابوبکر کی طرح حضرت عمار بھی آپ کے دوست تھے۔ کتب سیرت میں درج ابن اسحاق کی یہ روایت مشہور ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت و دیانت کا شہرہ سن کر سیدہ خدیجہ نے مال تجارت دے کر اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ شام بھیجا۔ میسرہ نے واپس آ کر آپ کی نیک نامی کا اور بھی چرچا کیا، اس نے بتایا کہ سخت گرمی میں دو فرشتے آپ پر سایہ فگن ہوتے تھے اور ایک عیسائی راہب نے آپ کے نبی ہونے کا اشارہ کیا۔ یہ باتیں سن کر سیدہ خدیجہ کو رغبت ہوئی اور انھوں نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ اس ضمن میں ایک دوسری روایت بھی نقل کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ آپ اور عمار بن یاسر مکہ کے بازار 'حزورہ' سے گزر رہے تھے۔ سیدہ خدیجہ کی بہن نے جو وہاں چمڑا بیچ رہی تھیں، حضرت عمار کو بلا کر آپ کے لیے سیدہ خدیجہ کا رشتہ تجویز کیا۔ آپ نے رضامندی ظاہر کی تو اگلے ہی روز یہ پاک جوڑا نکاح کے بندھن میں بندھ گیا۔ (مجمع الزوائد)

مکہ نور اسلام سے منور ہوا تو حضرت یاسر نے ایمان لانے اور اس کا اظہار کرنے میں دیر نہ لگائی۔ ان کی اہلیہ حضرت سمیہ نے ان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ وہ اسلام کی طرف لپکنے والے نفوس قدسیہ (السابقون الاولون) میں شامل ہوئے۔ حضرت عمار اور حضرت صہیب رومی ایک ہی روز ایمان لائے۔ ابن اثیر کہتے ہیں، تب اہل ایمان کی تعداد تیس سے کچھ اوپر ہو چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم منتقل ہو چکے تھے۔ غالب گمان ہے کہ ان کے والد حضرت یاسر اور والدہ حضرت سمیہ ان سے پیشتر نعمت اسلام سے سرفراز ہوئے۔ حضرت یاسر کے دوسرے بیٹے عبداللہ نے بھی دین حق کی دعوت پر لبیک کہا۔ حضرت عمار بن یاسر فرماتے ہیں، (ابتداے اسلام میں) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حال میں دیکھا ہے کہ پانچ غلام، دو عورتوں اور (ایک آزاد مرد) سیدنا ابوبکر کے علاوہ آپ کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ (بخاری، رقم ۳۶۶۰) ابن حجر کہتے ہیں، مذکورہ پانچ غلاموں میں حضرت بلال، زید بن حارثہ،

عامر بن فہیرہ اور ابوفکیہہ کا شامل ہونا یقینی ہے تاہم پانچویں غلام مومن کے بارے میں مختلف احتمالات ہیں۔ممکن ہے کہ وہ شقران ہوں، یاسر عنسی ہوں یا خود راویِ حدیث عمار بن یاسر ہوں۔اس روایت میں دو عورتوں سے مراد سیدہ خدیجہ اور سمیہ یا ام ایمن ہیں۔حضرت عمار نے ایمان لانے والے آزاد مردوں میں صرف سیدنا ابوبکر کا نام لیا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ احرار مسلمانوں کی ایک جماعت موجود تھی جو اعزہ واقارب سے اپنا ایمان چھپائے ہوئی تھی۔

جب آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا، بنومخزوم کی سیادت عمرو بن ہشام (ابوجہل) کے پاس آ چکی تھی۔وہ اول روز سے اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت سمیہ اس کی اور دوسرے مشرکین کی ایذاؤں کا خاص نشانہ بننے والے سات اصحاب میں شامل ہوئیں۔(ابن ماجہ، رقم ۱۵۰) حضرت یاسر ان کے ساتھ تھے۔حضرت یاسر سے ان کے حلیف قبیلے والوں نے پوچھا، کیا سچ ہے، تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لے آئے ہو؟ حضرت یاسر نے کہا، ہاں۔مزید کہا، تمھیں پتا ہے، وہ ہمارے معبودوں اور آبا کی تنقیص کرتے ہیں؟ جواب دیا، ہاں۔پھر بھی ان کی پیروی کرتے ہو؟ کیا تمھیں لات، عزیٰ اور ہبل پر ایمان نہیں رہا؟ حضرت یاسر نے کہا، ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے حق ہونے کا یقین ہے، آسمانوں اور زمین کا مالک اللہ ہی ہمارا رب ہے۔حضرت سمیہ نے بھی پختہ ایمان ظاہر کیا تو بنومخزوم نے اپنے تشدد میں اضافہ کر دیا۔حضرت یاسر اور سمیہ کو زنجیروں سے باندھ کر سخت گرمی میں کھلے آسمان تلے گرم ریت پر لٹا دیا جاتا۔انھیں پیٹا جاتا، کوڑے برسائے جاتے، داغا جاتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہنے اور لات وعزیٰ کی ستایش کرنے کو کہا جاتا۔وہ اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ کے کلمے بلند کرتے تو سینوں پر بھاری پتھر رکھ دیے جاتے۔اس قدر تکلیف دی جاتی کہ ذہن ماؤف ہو جاتا اور انھیں اپنی کہی بات سمجھ نہ آتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر، عمار، سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد (یا خباب) اپنے اسلام کا اظہار کرنے والے پہلے سات نفوس تھے۔آپ کی حفاظت آپ کے چچا ابوطالب نے کی، سیدنا ابوبکر کو ان کی قوم نے بچایا، باقی پانچوں کو مشرکین لوہے کی زرہیں پہنا کر تپتی دھوپ میں بٹھا دیتے۔غلام ہونے کی وجہ سے ان کا دفاع کرنے والا کوئی نہ تھا۔ان میں سے کوئی نہ تھا جس نے مشرکین کی بات نہ مانی، حضرت بلال ہی تھے جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان کی پروا نہ کی، ان کی قوم کو بھی ان کا خیال نہ ہوا۔کافروں نے ان کو بچوں کے حوالے کر دیا، وہ انھیں پکڑ کر مکہ کی گھاٹیوں میں گھومے پھرے، وہ ''اللہ ایک ہے''، ''اللہ ایک ہے'' کی صدا لگاتے رہے۔(مسند احمد، رقم ۳۸۳۲، ابن ماجہ، رقم ۱۵۰)

جسمانی سزائیں دینے کے علاوہ اہل مکہ کو مستضعفین کے ساتھ لین دین کرنے سے منع کر دیا گیا۔ دونوں میاں بیوی نے عمر رسیدہ اور ضعیف ہونے کے باوجود صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا۔ مسلمان اس وقت تعداد میں کم اور کم زور تھے، ان میں سے بھی اکثر نے اپنا ایمان مخفی رکھا تھا اس لیے مشرکوں کو جور وستم سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ان کی ایذاؤں کی تاب نہ لا کر پہلے حضرت یاسر شہادت سے سرفراز ہوئے۔ تاریخ اسلامی میں ان کے آخری ایام اور شہادت کے حالات کا ذکر نہیں ملتا، البتہ حسب ذیل روایتوں سے ان مظالم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو ان کی جان لینے کا سبب بنے۔ سیدنا عثمان بتاتے ہیں، ایک بار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کے ریگ زار گیا، آپ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ حضرت یاسر، سمیہ اور عمار کے پاس سے آپ گزرے (تو دیکھا کہ) انھیں ایذائیں دی جا رہی ہیں۔ حضرت یاسر نے التجا کی، یا رسول اللہ! کیا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا؟ آپ نے جواب دیا، صبر کرو، پھر دعا فرمائی، اللہ! آل یاسر کی مغفرت کر دے۔ بلاشبہ تو نے مغفرت کر دی ہے۔ (مسند احمد، رقم ۴۳۹) اس روایت کے راوی سالم بن ابو جعد کی عثمان سے ملاقات ثابت نہیں، روایت کے اس ضعف کو امام مسلم کی شرائط پر پورا اترنے والی مستدرک حاکم کی یہ حدیث دور کر دیتی ہے:

صبرًا يا آل ياسر، ان موعدكم الجنة.   ''آل یاسر صبر سے چپکے رہو، تم سے جنت کا وعدہ ہے۔''
(مستدرک حاکم، رقم ۵۶۴۶)

حضرت عمار نے کہا، یا رسول اللہ! ہم پر پوری شدت سے عذاب ٹوٹ پڑا ہے۔ آپ نے فرمایا، ابو الیقظان! (عمار کی کنیت) صبر کرو پھر رب سے التجا کی، 'اللّٰهم لا تعذب احدًا من آل ياسر بالنار'۔ ''اے اللہ! آل یاسر میں سے کسی کو دوزخ کی سزا نہ دینا۔'' (الاستیعاب)

حضرت یاسر کی شہادت کے بعد حضرت سمیہ کا ایمان اور پختہ ہو گیا۔ تب ابوحذیفہ کے بیٹوں نے انھیں ابو جہل کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے ان پر خوب ظلم ڈھایا اور طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں۔ آخر کار اس نے ان کے پیٹ کے نچلے حصے میں بھالا دے مارا اور ان کی جان لے لی۔ ان کی تاریخ شہادت ہجرت نبوی سے سات سال پہلے ۶۱۵ء ہے۔ حضرت عمار کو بھی تپتی دھوپ میں لٹا کر، ان کے سینے پر بھاری پتھر رکھ کر یا پانی میں ڈبکیاں دے کر ایذا دی جاتی رہی۔ انھیں کہا گیا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دے دو، لات وعزیٰ کو بھلا کہہ دو تو ہم تجھے چھوڑ دیتے ہیں۔ شدت تکلیف سے عاجز آ کر انھوں نے یہ سب کہہ دیا، پھر روتے روتے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے سوال فرمایا، تم اپنے دل کو کس کیفیت میں پاتے ہو؟ جواب دیا، میں اسے ایمان پر مطمئن پاتا ہوں۔

فرمایا، دوبارہ ایسی صورت حال پیش آئے تو پھر یہی کچھ کرنا۔(مستدرک حاکم، رقم ۳۳۶۲) شیعہ اسے تقیہ کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں۔ابن مسعود کی روایت (ابن ماجہ، رقم ۱۵۰) کی یہ بات کہ حضرت بلال کے علاوہ سزائیں جھیلنے والے ہر اولوالعزم نے مشرکوں کی مانگ پوری کی، یعنی بظاہر کفریہ کلمات کہہ کر جان بچائی، حضرت یاسر اور حضرت سمیہ کی سیرتوں کے مطالعہ سے غلط ثابت ہو جاتی ہے تاہم حضرت عمار بن یاسر ضرور اس زمرہ میں شامل ہوئے۔

افسوس کہ حضرت یاسر کی تاریخ شہادت کے بارے میں ہمیں کوئی راہ نمائی نہیں ملتی تاہم جن مؤرخین نے ان کی شہادت کا ذکر کیا ہے، اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ وہ حضرت سمیہ کے منصب شہادت پر فائز ہونے سے پہلے جام شہادت نوش کر چکے تھے۔اس لیے مجاہد کے اس قول کی کہ ''سمیہ عہد اسلامی کی پہلی شہید تھیں'' یہ تاویل کی جائے گی کہ وہ پہلی شہید عورت تھیں۔ابن سعد اور ابن قتیبہ کہتے ہیں، حضرت یاسر کے شہید ہونے کے بعد سمیہ حارث بن کلدہ کے رومی غلام یاسر ازرق کے نکاح میں آئیں۔مزی اور ذہبی نے اس قول کو اختیار کیا ہے، لیکن ابن عبدالبر اور ابن حجر نے قطعی غلط قرار دیا۔

حضرت یاسر اور حضرت سمیہ کی شہادت کے وقت اہل ایمان پر بڑا کٹھن وقت تھا۔ان کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کا مشورہ دیا۔ایک روایت کے مطابق حضرت عمار بن یاسر بھی ان مہاجرین میں شامل تھے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، دلائل النبوۃ (بیہقی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، البدایۃ و النہایۃ (ابن کثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، فتح الباری (ابن حجر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، منتہی الآمال فی تاریخ النبی والآل (عباس قمی)، نساء مبشرات بالجنۃ (احمد خلیل جمعہ)، یاسر پسر عامر (وکی پدیا، دانشنامہ آزاد)۔

محمد عمار خان ناصر*

پاکستان میں مذہبی تعلیم

[۹ جولائی ۲۰۱۲ء کو PIPS کے زیر اہتمام تعلیم کے موضوع پر منعقد کیے جانے والے سیمینار کے لیے لکھا گیا۔]

پاکستان میں مختلف سطحوں پر مذہبی تعلیم کے موجودہ انتظام کے مثبت اور منفی پہلوؤں اور اس نظام میں بہتری کے امکانات کے حوالے سے متنوع زاویوں سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں مذہبی تعلیم کے نظام کے ساتھ جو بڑے بڑے مسائل وابستہ ہیں، انھیں اہل علم کے سامنے بیان کرنے کی شاید زیادہ ضرورت نہیں۔ اختصار کے ساتھ انھیں چند نکات کی صورت میں گنوایا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ مذہب جن روحانی واخلاقی اقدار کی تعلیم دیتا ہے، موجودہ مذہبی نظام تعلیم عمومی طور پر ان سے بالکل برعکس قدروں کے فروغ کا ذریعہ بن رہا ہے جن میں سب سے نمایاں چیز مذہبی فرقہ واریت ہے۔ مزید براں تربیت کا سارا زور دین کے مظاہر پر صرف کیا جاتا ہے، جبکہ روحانی بالیدگی اور اخلاق و کردار کی بلندی پیدا کرنے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی۔

۲۔ مذہبی تعلیم ایک ایسے ماحول میں فراہم کی جاتی ہے جو اپنے فیض یافتگان کو معاشرے کے زندہ مسائل کے ساتھ حرکی طور پر متعلق کرنے کے بجائے ان کے اور معاشرے کے مابین اجنبیت کی ایک خلیج حائل کر دیتا ہے۔

۳۔ مذہبی تعلیم کے نتیجے میں مطالعہ اور علم و تحقیق کا جو معیار حاصل ہوتا ہے، وہ مجموعی طور پر نا قابل رشک ہے اور اس سے بھی زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس ماحول میں مطالعہ اور تحقیق کے موضوعات کا دائرہ نہایت محدود ہے اور

---

* مدیر ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ۔

امت مسلمہ کی وسیع تر کلاسیکی علمی روایت اور دور جدید کے علمی وفکری مباحث سے ایک عمومی آ گاہی بھی اس نظام تعلیم کے اہداف میں شامل نہیں۔

۴۔ مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام نے ریاستی نظام اور بین الاقوامی قانون کے ضمن میں دور جدید کی جوہری تبدیلیوں سے متعلق اجتہادی زاویۂ نگاہ کو اپنے اہداف کا حصہ نہیں بنایا، چنانچہ اس حوالے سے کلاسیکی دور کے فقہی ذخیرے کو غیر تنقیدی انداز میں پڑھانا ان فکری ونظری ابہامات کی جڑ کی حیثیت رکھتا ہے جن سے اس وقت ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد کا شرعی ونظریاتی جواز اخذ کیا جا رہا ہے۔

اس نوعیت کے اور بھی بہت سے امور اس فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں، تاہم میرے خیال میں موجودہ تناظر میں مذہبی تعلیم کے نظام کی بہتری اور اصلاح کے ضمن میں زیادہ اہم اور غور طلب سوال یہ ہے کہ اس میں معاشرے کے دوسرے طبقات اور ریاست کا کردار کیا ہونا چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں لبرل حلقوں کا عمومی زاویۂ نگاہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ قومی نظام تعلیم میں مذہب کے عنصر کو کم سے کم جگہ دی جانی چاہیے تاکہ مذہبی سوچ کو تعلیم کے راستے سے نئی نسل کے ذہن اور فکر ورجحان پر زیادہ اثر انداز ہونے کا موقع نہ ملے۔ تاہم اب تک کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہ طرز فکر غیر مطلوب نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے۔ اگر قوم کی علمی، تعلیمی اور روحانی ضروریات سے متعلق ایک بے حد اہم شعبہ بالکل صحیح خطوط پر استوار کرنے کے بعد کسی ایک مخصوص طبقے کے سپرد کر دیا جائے اور معاشرہ اور ریاست اس سے اپنے آپ کو بالکل لاتعلق کر لیں تو اس سے احتساب اور جواب دہی کا احساس ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد جب وہ طبقہ اپنی سیاسی طاقت بھی پیدا کر لے تو پھر اس کی اصلاح کے لیے کوئی موثر کردار ادا کرنا ریاست اور معاشرے کے لیے بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم ہمارے ہاں دینی تعلیم کے نظام کے باب میں یہی ہوا ہے جو اس لحاظ سے زیادہ بگاڑ کا موجب بنا ہے کہ دینی تعلیم کا نظام سرے سے درست خطوط پر استوار ہی نہیں تھا اور نوآبادیاتی دور سے چلا آنے والا نظام نہایت بنیادی پہلوؤں سے اصلاح بلکہ تشکیل نو کا محتاج تھا۔ بدقسمتی سے اس اصلاح کے لیے مذہبی تعلیم کے نظام میں داخلی طور پر کوئی خاص داعیہ موجود نہیں تھا۔ اس پر جب ریاست اور معاشرے نے بھی اس ضمن میں کوئی مثبت کردار ادا کرنے سے دست کشی اختیار کر لی تو ان خرابیوں نے اپنی جڑیں مزید مضبوط کر لیں اور اب پینسٹھ سال کے بعد کیفیت یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے نظام کی اصلاح کا عزم تو دور کی بات ہے، ریاست اور معاشرہ ابھی تک اس کا کوئی واضح نقشہ بھی ذہن میں نہیں رکھتے۔

میری نظر میں اس سارے قضیے میں ریاست اور سول سوسائٹی میں سب سے بنیادی چیز جو پیدا کرنے کی ضرورت

ہے، وہ فکری وضوح، احساس ذمہ داری اور اصلاح کا مخلصانہ عزم ہے۔ چنانچہ معاشرے کی تشکیل میں مذہب اور مذہبی تعلیم کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرنے کے بعد پوری نیک نیتی، خلوص اور کھلے ذہن کے ساتھ ایک تدریج کے ساتھ حسب ذیل اقدامات کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ مذہبی تعلیم کی ضروریات، معیارات اور اہداف کا ایک واضح نقشہ تیار کیا جائے جو ان روحانی، علمی وفکری اور معاشرتی ضروریات کی تکمیل کا ضامن ہو جو مذہب اور مذہبی تعلیم سے وابستہ ہیں۔

۲۔ ریاست اور سول سوسائٹی اس نقشے کے مطابق مذہبی تعلیم کے انتظام کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں۔ اس کے لیے سرکاری نظام تعلیم سے جو کام لیا جا سکتا ہے، اس کا بھی گہرائی سے جائزہ لے کر اقدامات تجویز کیے جائیں اور سول سوسائٹی جو کردار ادا کر سکتی ہے، اس پر بھی گہرا غور وخوض کیا جائے۔

۳۔ حکومت اور سول سوسائٹی کی طرف سے مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام کے کارپردازان کو ایک مثبت اور تعمیری مکالمے میں شریک کیا جائے اور انھیں اپنے نظام میں مطلوب اصلاحات کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

مذکورہ گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام کی اصلاح میں ریاست اور سول سوسائٹی اگر کوئی کردار ادا کرنا چاہتی ہے تو اس میں اس حقیقت کو بنیادی نکتے کے طور پر تسلیم کرنا ہوگا کہ پاکستانی قوم اپنی روحانی و اخلاقی اقدار، خاندانی ومعاشرتی زندگی کے اصول وضوابط اور اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں مذہب یعنی اسلام کو راہ نمائی کا بنیادی سرچشمہ اور ماخذ تصور کرتی ہے اور اسلام کی تعلیمات سے ہٹ کر کوئی دوسری چیز یہاں حیات اجتماعی کی تشکیل میں بنیادی حوالہ نہیں بن سکتی۔ اس لحاظ سے مذہبی تعلیم کے مسئلے کو کسی ایک مخصوص طبقے کا نہیں، بلکہ ریاست اور معاشرے کی تعمیر وتشکیل سے دلچسپی رکھنے والے تمام سنجیدہ وفہمیدہ طبقات کے غور وفکر کا موضوع ہونا چاہیے اور تمام طبقات کو ایک مثبت اور تعمیری جذبے کے ساتھ مذہبی تعلیم کے نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہ بنیادی ذہنی رویہ پیدا ہونے سے ہی وہ سنجیدگی، بصیرت اور عزم وحوصلہ پیدا ہوگا جو اس مقصد کے لیے درکار ہے۔ بصورت دیگر یہ معاملہ ایک طرف مذہبی طبقات اور دوسری طرف مذہبی نظام تعلیم کی اصلاح کی خواہش رکھنے والوں کے مابین ایک بے حاصل کشمکش کا عنوان بنا رہے گا جس میں واضح سوچ، خلوص اور عزم وحوصلہ مفقود ہونے کی وجہ سے ریاست اور سول سوسائٹی دن بدن اپنے مطالبات کا جواز کھوتے چلے جائیں گے اور مذہبی طبقات نسبتاً واضح اور مضبوط موقف رکھنے کی وجہ سے سماجی اور اخلاقی دباؤ سے آزاد ہوتے چلے جائیں گے۔

الطاف احمد اعظمی*

نظام سرمایہ داری اور اسلام

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

۳

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ. (سورۂ حشر ۵۹: ۷)

''اللہ جو مال بستی والوں سے لڑائی کے بغیر اپنے رسول کو دلا دے، اس میں اللہ کا، رسول کا، قرابت والوں کا، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی میں نہ گردش کرتا رہے۔''

مذکورہ قرآنی ہدایت کے مطابق ارتکاز مال وزر کو روکنے کے لیے جو اخلاقی اور قانونی تدابیر اختیار کی گئی ہیں ان کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔اخلاقی تدابیر

اس سلسلے میں ایک طرف اصحاب مال کو جو اپنا فاضل سرمایہ غربا و مساکین پر خرچ کرنے کے بجائے اندوختہ کر کے رکھتے ہیں، آخرت کے بدترین عذاب سے ان لفظوں میں خبردار کیا گیا ہے:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا ''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور

* آر زیڈ ۹۰۱ بی، فلیٹ نمبر ۲۰۲، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی-۱۹۔

يُنفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ. (سورۂ توبہ ۹: ۳۴-۳۵)

ان کو اللہ کے راستے میں نہیں خرچ کرتے، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔ جس دن کہ ان پر (یعنی سونے اور چاندی کے ذخیرے پر) دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی، پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پسلیوں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا، تو اب اپنے اس اندوختہ کا مزہ چکھو۔''

اور دوسری طرف ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جو سماج کے ناداروں کی خبر گیری میں اپنا مال خوشی سے رضاے الٰہی کی طلب میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کو خوش خبری دی گئی ہے کہ انفاق سے ان کے مال میں کمی کے بجاے کئی گنا اضافہ ہوگا۔ فرمایا ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. (البقرہ ۲: ۲۶۱)

''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ جس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال کے اندر سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے دونا عطا کرتا ہے۔''

آگے اسی سورہ میں فرمایا ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. (البقرہ ۲: ۲۶۵)

''جو لوگ اللہ کی رضا جوئی اور اپنے نفوس کے قرار و ثبات کے لیے اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال اس باغ کی ہے جو بلندی پر واقع ہو، اس پر زور کی بارش ہوگئی تو دوگنا پھل لایا، اور اگر زور کی بارش نہ ہوئی تو (اس کے ثمر آوری کے لیے) پھوار ہی کافی ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو اللہ دیکھ رہا ہے۔''

۲۔ قانونی تدابیر

ارتکاز مال کو روکنے کے لیے جو قوانین بنائے گئے ان میں پہلا قانون زکوٰۃ کا ہے۔ ہر وہ شخص جو صاحب مال

ہے (یعنی غنی) اس پر قانوناً واجب ہے کہ وہ اپنے فاضل سرمائے پر زکوٰۃ نکالے۔ اس کا نصاب مقرر ہے اور اس نصاب کے مطابق یہ زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ جن لوگوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں خرچ کریں، حتیٰ کہ غربا پر بھی واجب ہے کہ وہ صدقہ کریں[11]۔ اس طرح اسلامی معاشرے میں انفاق کا ایک عام مزاج و ماحول پیدا ہوتا ہے۔

ارتکاز مال کو روکنے کے لیے جو دوسرا قانون بنایا گیا وہ حرمت سود کا ہے (البقرہ ۲: ۲۷۵)۔ سود در اصل حب مال اور ازدیاد مال کی علامت ہے اور اس بات کا ثبوت کہ سودی کاروبار کرنے والا سماج کے کم زور طبقات کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں رکھتا، بلکہ ان کا استیصال کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل راہ خدا میں انفاق کرنے والا اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ حب مال اور جمع مال کی فکر سے نجات پا چکا ہے۔ اس کو صرف اللہ کی رضا جوئی عزیز ہے اور وہ سماج کے غربا و مساکین کا دل سے خیر خواہ ہے۔

اس سلسلے میں جو تیسرا قانون بنایا گیا وہ قانون میراث ہے۔ موجودہ دور میں ارتکاز زر کا ایک بڑا سبب یہ قانون ہے کہ باپ کی جائداد پر صرف لڑکے کا حق ہے۔ اس غلط قانون میراث کی وجہ سے نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی خاندان میں دولت کی بڑی مقدار جمع ہو جاتی ہے، لیکن اسلام کا قانون میراث کہیں بھی دولت کو جمع نہیں ہونے دیتا، ایک خاص مدت کے بعد جمع شدہ دولت بکھر کر ایک سے زیادہ افراد کے پاس پہنچ جاتی ہے اور اس طرح دولت برابر معاشرے میں گردش میں رہتی ہے۔ اس سے نہ صرف تجارت کو فروغ ملتا ہے، بلکہ لوگوں کے اندر انفاق کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

ارتکاز مال کی ایک صورت سونے اور چاندی کے برتن اور زیورات بھی ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کھانے اور پینے کے لیے سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا، وہیں عورتوں اور مردوں دونوں کو نصیحت کی کہ وہ سونے کے زیورات استعمال نہ کریں۔ اس سلسلے میں چند روایات ملاحظہ ہوں:

۱۔لا تشربوا فی آنیة الذھب والفضة ولا تاکلوا فی صحافھا. (صحاح ستہ)	''سونے اور چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیا کرو اور نہ ہی ان کے پیالوں میں کھانا کھایا کرو۔''
۲۔الّذی یاکل ویشرب فی آنیة الفضة انه یجر فی بطنه نار جھنم. (صحیح بخاری)	''جو شخص چاندی کے برتن میں کھانا کھاتا اور پانی پیتا ہے وہ اپنے شکم میں جہنم کی آگ سمیٹتا ہے۔''
۳۔یالیت اُمتی لا تحمل الذھب.	''کاش میری امت (کے عورت اور مرد) سونے

۱۱؎ بخاری، کتاب الادب، باب: کل معروف صدقة۔

کے زیور نہ پہنتے۔'' (مسند احمد)

ام عطیہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے لیے سونے کے زیور استعمال کرنے کی اجازت چاہی گئی تو آپ نے انکار کیا 'فابی علینا'۔ ایک عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے کے مختلف زیورات کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا کہ اس کی اجازت ہے؟ ہر ایک سوال کے جواب میں آپ یہی فرماتے کہ آگ کا زیور 'النّار' ہے۔ اس نے آخر میں کہا کہ عورت جب اپنے شوہر کے لیے بناؤ سنگار نہیں کرتی تو وہ اس کی نظر سے گر جاتی ہے 'ان المرأة اذا لم تتزين لزوجها صلفت عنده'۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

ما يمنع احدا كن ان تضع قرطين من فضة ثم تصفر بزعفران او بعبير. (مسند احمد)	''تم عورتوں کو کس چیز نے اس سے روکا ہے کہ چاندی کی دو بالیاں (اپنے کانوں میں) ڈال لیں اور ان کو زعفران یا عبیر سے رنگ دیں (تا کہ وہ مثل سونے کے ہو جائیں)۔''

سونے اور چاندی کے استعمال کی اس ممانعت کی وجہ اخلاقی سے زیادہ معاشی ہے۔ ملحوظ رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سونے اور چاندی کی حیثیت زر مبادلہ کی تھی، بالخصوص چاندی جو درہم کی شکل میں رائج تھی اور خرید و فروخت میں استعمال ہوتی تھی۔

زمین کا اجارہ

اسلام کے معاشی نظام میں جس طرح یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ اموال (سونا، چاندی، نقدی) کو جمع کر کے رکھا جائے، اسی طرح اس چیز کو بھی ناپسند کیا گیا ہے کہ لوگوں کے پاس زائد از ضرورت زمین ہو، یا زمین ہو اور اس میں کاشت نہ کی جائے۔ اس سلسلے میں چند روایات قابل ذکر ہیں:

۱۔ حضرت رافع بن خدیج روایت کرتے ہیں کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے منع فرما دیا جو بظاہر ہمارے لیے نفع بخش تھا اور وہ یہ کہ ہم میں سے کسی شخص کے پاس زمین ہو تو وہ اس کو بٹائی پر دے اور نہ نقد لگان (اجارہ) پر، اور فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے پاس زمین ہو تو وہ خود اس میں کاشت کرے یا اپنے مسلمان بھائی کو کاشت کے لیے احسان کے طور پر دے دے۔''[12]

[12] بخاری، باب المزارعۃ، ترمذی، باب الزکوٰۃ۔

اس سلسلے میں حنظلہ بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج سے زمین کو اجارہ لینے کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں

۲۔حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس زمین ہو تو اس کو چاہیے کہ خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کے لیے احسان کے طور پر دے دے، اور اگر دونوں میں سے کوئی بات کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو اپنی زمین کو یوں ہی روکے رکھے۔''[۱۳]

۳۔حضرت جابر کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرما دیا ہے کہ زمین کے ذریعہ سے عوض یا اجارہ (اجر و حظ) کا فائدہ اٹھایا جائے۔[۱۴]

۴۔حضرت عبداللہ ابن عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے حضرت امیر معاویہ کے عہد تک اپنی زمین کاشت کاروں کو دے کر ان سے لگان لیتے تھے، مگر جب انھوں نے رافع کی حدیث سنی تو اس عمل کو اس خوف سے ترک کر دیا کہ شاید نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس کی ممانعت فرمائی ہو۔[۱۵]

راقم کا خیال ہے کہ اس ممانعت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کے پاس فاضل زمینیں تھیں اور وہ ان میں کاشت نہیں کرتے تھے بلکہ بٹائی یا نقد لگان پر کاشت کے لیے دوسروں کو دے دیتے تھے۔ان لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی زمینوں پر خود کاشت کریں یا دوسروں کو بطور احسان کاشت کے لیے دے دیں۔حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث سے جو اوپر نقل کی گئی ہے، اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔اس میں کہا گیا ہے کہ صاحب زمین خود کاشت کرے یا دوسروں کو کاشت کے لیے مفت دے دے، اور اگر یہ دونوں صورتیں منظور نہ ہوں تو پھر وہ زمین کو بغیر کاشت کے چھوڑ دے۔اس میں تنبیہ پوشیدہ ہے۔یہ بات ہر کسان جانتا ہے کہ جس زمین میں کاشت نہ کی جائے اس کی قوت نمو رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے۔

اس معاملے میں حضرت عبداللہ ابن عباس اور بعض دوسرے صحابہ سے جو اقوال مروی ہیں وہ محل نظر ہیں۔[۱۶]

نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔میں نے کہا کہ چاندی اور سونے کے بدلے بھی یعنی نقد لگان پر بھی منع فرمایا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔(بخاری و مسلم، کتاب المزارعۃ)۔اس روایت کا مضمون رافع بن خدیج ہی سے مروی مذکورہ بالا روایت سے مختلف ہے۔راقم کی نظر میں پہلی روایت صحیح ہے۔اس کی تائید عبداللہ ابن عمر کے آخری عمل سے ہوتی ہے۔

۱۳؎ مسلم، باب المزارعۃ۔

۱۴؎ مسلم، باب المزارعۃ۔

۱۵؎ بخاری، کتاب المزارعۃ۔

۱۶؎ عبداللہ ابن عباس کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو اجارہ پر دینے سے منع نہیں کیا، بلکہ یہ پسند فرمایا کہ صاحب زمین

حضرت عبداللہ ابن عمر کا عمل جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس پر دلیل ہے[17]۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت کا تعلق ایک وقتی مصلحت سے تھا، درست نہیں ہے[18]۔ حضرت ابوذر غفاری اور بعض دوسرے صحابہ کے طرز عمل سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے[19]۔

اجیر و اجرت

انفرادی ملکیت کے نظام کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں بالعموم مزدوروں کا استیصال ہوتا ہے۔ سرمایہ دار چاہتا ہے کہ کم اجرت پر ان سے زیادہ کام لے۔ صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں جیسا کہ سرمایہ داری کے تاریخی پس منظر کے ذیل میں ذکر ہو چکا ہے، سرمایہ داروں نے جس طرح مزدوروں کا استیصال کیا اور ان پر مظالم ڈھائے وہ سرمایہ داری نظام کی تاریخ میں ایک سیاہ باب ہے۔

لیکن اسلام کے معاشی نظام میں ہر طرح کا استیصال ممنوع ہے۔ وہ اس بات کی اجازت تو دیتا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے اجرت پر کام لے، لیکن اجیر (اجرت پر کام کرنے والا) اور مستاجر (جو کسی سے اجرت پر کام کرائے)

اپنے بھائی (یعنی کاشت کار) سے معاوضہ لینے کے بجائے حسن سلوک کے طور پر اس کو مفت دے دے (بخاری، کتاب المزارعۃ)۔

[17] بخاری، کتاب المزارعۃ۔

[18] شاہ صاحب نے اس خیال کو حضرت زید کی طرف منسوب کیا ہے۔ دیکھیں، حجۃ اللہ البالغہ، باب التبرّع والتعاون ۲/۱۱۷۔

[19] حضرت ابوذر غفاری زمین کا اجارہ اور مزارعت دونوں کو ناجائز سمجھتے تھے اور آخر عمر تک اس موقف پر قائم رہے، لیکن جمہور علما وفقہا اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ فقہا احناف کا اس میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بٹائی کی جو بھی صورت ہو وہ ناجائز ہے، لیکن نقد لگان پر معاملہ کرنا درست ہے۔ امام ابو یوسف نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک زمین کو نصف، تہائی یا چوتھائی بٹائی پر دینا جائز ہے (کتاب الخراج ۸۸)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ حدیث کی کتابوں میں نقد لگان کو درست قرار دینے سے متعلق جو روایت مذکور ہے وہ ''مدرج'' ہے، یعنی یہ سعید بن المسیّب کا قول ہے نہ کہ قول رسول۔ (فتح الباری ۵/۲۰)

لیکن مسئلہ یہ نہیں کہ بٹائی اور نقد لگان جائز ہے یا ناجائز جیسا کہ ہمارے بہت سے علما وفقہا نے خیال کیا ہے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا وہ لوگ جن کے پاس فاضل زمین ہے وہ اس کو بٹائی یا نقد لگان پر دے سکتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ جائز نہیں جیسا کہ مذکورہ روایات سے بالکل واضح ہے۔ ان کے لیے مستحسن طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی فاضل زمین اپنے غریب بھائیوں کو کاشت کے لیے دے دیں اور ان سے کوئی معاوضہ نہ لیں۔

کے درمیان اجرت کے تعین میں عدل و انصاف لازمی ہے۔ اگر ریاست محسوس کرے کہ مزدوروں کی اجرت میں انصاف سے کام نہیں لیا جا رہا ہے تو وہ خود سماجی اور معاشی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اجرتوں کا تعین کر سکتی ہے۔ اس معاملے میں نہ اجیر کے ساتھ زیادتی ہو اور نہ مستاجر کے ساتھ۔ قرآن کے الفاظ میں:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ. (البقرہ ۲: ۲۷۹)	''نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ میں تین آدمیوں کا قیامت کے دن فریق مخالف (خصیم) بنوں گا۔ ایک وہ شخص جس نے میرے نام سے کسی کو کچھ دیا اور پھر عہد شکنی کی، دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے، تیسرا وہ جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا، لیکن اس کو پوری مزدوری نہیں دی[20]۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی مزدور مستقل طور پر کھیت یا باغ میں کام کرتا ہو تو متعین مزدوری کے علاوہ اس سے حاصل ہونے والے نفع میں سے بھی اس کو کچھ دینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اعطوا العامل من عمله، فانّ عامل اللّٰه لا يخيب. (مسند احمد)	''مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو، کیوں کہ اللہ کا عامل (مزدور) نامراد نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

یہی معاملہ خادم کا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اذا صنع لاحدكم خادمه طعامًا ثم جاء بهٖ ولی حره ودخانه فليقعده معه فليأكل، فان كان الطعام مشفوها فليضع منه فی يده اكلة او اكلتين. (صحیح بخاری)	''اگر تمھارا خادم تمھارے لیے کھانا تیار کرے اور پھر اس کو لے کر تمھارے پاس آئے اور اس نے گرمی اور دھوئیں کو برداشت کیا تھا، تو اس کو اپنے ساتھ کھانے پر بٹھا لو۔ اور اگر کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو خادم کے ہاتھ پر ایک دو لقمہ ضرور رکھ دو۔''

ایک دوسری روایت میں آپ کا ارشاد ہے:

اخوانكم خولكم، جعل اللّٰه تحت ايديكم، فمن كان اخوه تحت يده فليطعمه مما ياكل وليلبسه ممّا يلبس، ولا تكلفوهم مما يغلبهم، فان كلفتموهم فاعينوهم. (صحیح بخاری)	''تمھارے ماتحت تمھارے بھائی ہیں، اللہ نے ان کو تمھارا مملوک بنایا ہے، تو جس کا بھائی اس کا مملوک ہو تو چاہیے کہ جو خود کھاتا ہو، اس کو کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے۔ اور ان پر کام کا اتنا بوجھ نہ ڈالو جو ان کو مغلوب کر دے (یعنی ان کی طاقت سے باہر ہو)،

۲۰؎ بخاری۔

اور اگر ان پر کسی کام کا بوجھ ڈالو تو پھر ان کی مدد کرو۔‘‘

اس روایت میں مملوک، یعنی خادم کو مالک کا بھائی کہا گیا ہے، اس لیے اس کے ساتھ ایک بھائی کی طرح سلوک لازمی ہے۔ ابومسعود بدری کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے غلام کو کوڑے سے مار رہے تھے کہ دفعتاً آواز آئی: 'اعلم ابا مسعود' ''خبردار ابومسعود۔'' وہ کہتے ہیں کہ میں اس قدر غصے میں تھا کہ مجھے کچھ پتا نہ چلا کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سامنے کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں: 'اعلم ابا مسعود، انّ اللّٰہ اقدر علیك علی ھذا الغلام' ''خبردار، ابومسعود، اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتے ہیں جتنی قدرت تم اپنے اس غلام پر رکھتے ہو۔''[21]

ان روایات سے بالکل واضح ہو گیا کہ اسلام میں مالک اور خادم کے درمیان تعلق کی نوعیت وہ نہیں جو عام طور پر دنیوی نظاموں میں پائی جاتی ہے۔ یہ تعلق دو بھائیوں جیسا ہے۔ جہاں تک اجیر اور مستأجر کا تعلق ہے تو وہ بھی انصاف پر مبنی ہے۔ اسلام کے معاشی نظام میں مزدور محض پیداواری مشین کا کوئی بے روح پرزہ نہیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک انسان کی ہے جو مالک ہی کی طرح احساسات اور جذبات رکھتا ہے اور پیداواری عمل میں بھرپور شریک ہوتا ہے۔ اس لیے وہ مزدوری کے علاوہ کا بھی حق دار ہے، بالخصوص جب کاروبار میں نفع کثیر حاصل ہو۔

اسلامی نظام معیشت میں مزدوروں اور سماج کے دوسرے کم زور طبقات کے ساتھ اس لیے بھی ناانصافی کے امکانات بہت کم ہیں کہ ملکیت رکھنے کے باوجود ہر صاحب ایمان جانتا ہے کہ وہ درحقیقت خدا کی ملکیت ہے اور اس کی حیثیت نگراں اور امین کی ہے۔ اس لیے اس کا کار منصبی یہ ہے کہ وہ مالک حقیقی کی مرضی کے مطابق اس کی ملکیت کا انتظام کرے، خود اس سے فائدہ اٹھائے اور جو حاجت مند ہیں ان کو بھی اس سے فائدہ پہنچائے۔ اسے معلوم ہے کہ اصل مالک ایک روز اپنی ملکیت کا اس سے ضرور حساب لے گا۔

جواب دہی کا یہ اخروی تصور معاشی انصاف کے قیام میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ عصری معاشی نظامات کی ناکامی کے جہاں دوسرے اسباب ہیں، وہاں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں اس نوع کی جواب دہی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام کے معاشی نظام کے اس مختصر تقابلی تعارف سے معلوم ہو گیا کہ اسلامی نظام معیشت میں نہ افراط کے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ تفریط کی کوئی گنجایش۔ دوسرے لفظوں میں اس میں نہ تو انفرادی ملکیت کے نظام کی خرابیاں ہیں اور نہ ہی اجتماعی ملکیت کے عیوب و مفاسد، وہ ایک ایسا معتدل معاشی لائحۂ عمل ہے جس کو اختیار کر کے

---

21 صحیح مسلم۔

انسان کے پیچیدہ معاشی مسائل کو بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک بار پھر دنیا کو وہی معاشی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے جو کبھی خلافت راشدہ میں لوگوں کو حاصل تھا۔ اس دور زریں کی معاشی فارغ البالی کا حال بیان کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اصحاب مال اپنے صدقات لیے پھرتے تھے اور ان کو کوئی لینے والا نہ تھا۔[22]

''...تمام نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم وحوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ نسل آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی و عجمی، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں، سب خدا کی مخلوق اور سب آدم کی اولاد ہیں۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے۔ اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں۔''

(تدبر قرآن ۲/۲۴۶)

۲۲؎ البدایۃ والنہایۃ، طبع بیروت ۱۹۶۶ء، ۵/ ۶۴۔

پروفیسر خورشید عالم

میاں بیویوں کے کفیل ہیں

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ. (النساء۴: ۳۴)

''مرد (میاں) عورتوں (بیویوں) کے ذمہ دار (کفیل) ہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے اموال میں سے کچھ خرچ کیا ہے۔ پس جو عورتیں نیک ہوتی ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور رازوں کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کی حفاظت کی ہے۔''

اشراق اگست ۲۰۱۲ء کے شمارے میں فاضل محترم محمد عمار خان ناصر کا ایک مضمون ''خواتین ان کے حقوق اور مسائل'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ میں نے مضمون کی دو ایک باتوں سے اختلاف کیا اور میرا مضمون اشراق ہی کے نومبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ خواہش تھی کہ فاضل محترم جواب میں حسب عادت کوئی لطیف علمی نکتہ بیان کریں گے جس سے میں فیض یاب ہو سکوں گا۔ خواہش تو پوری نہ ہوئی البتہ رضوان اللہ صاحب کے نوک قلم سے ایک مضمون اشراق کے فروری ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے جس میں میرے مضمون پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ صاحب مضمون نے میرے مضمون کو غور سے پڑھے بغیر مناظرانہ رنگ میں تنقید بلکہ تنقیص شروع کر دی، کاش اپنے مضمون میں وہ تنقید کا رخ ان شخصیات کی طرف بھی موڑ دیتے جن کا حوالہ میں نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ میں نے کوئی بات حوالے کے بغیر نہیں لکھی۔ میں اپنے آپ کو عقل کل نہیں سمجھتا، جبکہ صاحب مضمون نے ہر بات حوالے کے بغیر کہی ہے۔ لگتا ہے وہ اپنے آپ کو بیک وقت مفسر، لغوی اور نحوی تصور کرتے ہیں۔ ان کی ہر

بات سے معلوم ہوتا ہے کہ

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اصل مشکل یہ ہے کہ مضمون نگار کے ذہن میں مرد کی فضیلت کا ایک مخصوص خیال راسخ ہے جس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ تاویل کر کے اللہ کے احکام کو پاژند بنا رہے ہیں۔ یہ خیال کہ مرد کو صرف مرد ہونے کے ناطے عورت پر خلقی فضیلت ہے قرآنی فکر و حکمت سے متصادم ہے۔ مرد بھی انسان ہے عورت بھی انسان۔ دونوں کو اللہ نے 'احسن تقویم' میں پیدا کر کے دونوں کو اشرف المخلوقات قرار دیا۔ دونوں کا ڈھانچہ بنانے کے بعد اپنی روح (Divine Energy) پھونکی۔ دونوں کو استعداد اعطا کی۔ دونوں کو اپنے احکام کا مکلّف ٹھہرایا اور دونوں جزا و سزا کے سزاوار ٹھہرے۔ جسمانی اعضا کا فرق حیاتیاتی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ قطعی طور پر وجہ فضیلت نہیں، فضیلت کا بس ایک ہی معیار ہے 'ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم' (۴۹:۱۳) ''اللہ کے نزدیک تم میں عزت والا وہ ہے جو متقی ہے۔'' اس معیار کے علاوہ رنگ، نسل اور جنس کی فضیلت کے سب معیار جھوٹے ہیں۔ تعجب ہے کہ ایک طرف صاحب مضمون یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آیت زیر بحث میں مرد کی مطلق فضیلت کا ذکر نہیں مگر دوسری طرف مرد کی خلقی فضیلت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید

سید قطب اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں زیر بحث آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں: ''یہ ایک خاندانی نظام ہے اس میں شریک مرد اور عورت مستقل شخصیت کے مالک ہیں، دونوں کے حقوق یکساں ہیں''۔

اب آتے ہیں ان اعتراضات کی طرف جن کی نشان دہی صاحب مضمون نے کی ہے۔

۱۔ میں نے 'الرجال' کا ترجمہ مرد اور 'النساء' کا ترجمہ عورتیں کرنے پر جس تحفظ کا اظہار کیا تھا وہ یہ ہے کہ بعض مفسرین 'الرجال' اور 'النساء' سے پہلے 'ال' کو جنس کا سمجھا ہے۔ اس طرح یہ ماننا پڑے گا کہ دنیا جہان کے مرد دنیا کی عورتوں پر خرچ کرنے کے مکلّف ہیں، جو قطعی غلط بات ہے۔ میں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ 'الرجال' اور 'النساء' سے میاں بیوی مراد نہیں ہو سکتے۔ صاحب مضمون نے ایک مفروضہ قائم کر کے اہل زبان کی بول چال اور عربی زبان کی خوب صورتی و بے ساختگی کا بے محل قصہ چھیڑ دیا ہے، حالانکہ اس زبان کی خوب صورتی کا ان کے مضمون میں اور دور دور تک کوئی سراغ نہیں ملتا۔ میں نے بھی مردوں سے میاں اور عورتوں سے بیویاں مراد لی ہیں اور صاحب مضمون نے بھی یہی معنی مراد لیے ہیں تو پھر بحث کس بات کی؟ یہ محض وقت کا ضیاع ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض لفظ 'قوّام علی' کی لغوی تحقیق کے بارے میں ہے۔ میں نے کہا ہے کہ عربی میں جب فعل کے بعد حرف جار کا صلہ (Preposition) آتا ہے تو معنی میں یا تو تخصیص پیدا ہو جاتی ہے یا معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ کم وبیش سب لغات نے یہ محاورہ دیا ہے 'قام الرجل المرأة و قام علیها'۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مرد نے عورت کو روزی مہیا کی۔ پھر میں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''لسان العرب'' کے مصنف ابن منظور نے یہ محاورہ لکھنے کے بعد زیر بحث آیت کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ اب میں کبھی ابن منظور کے قول کی طرف دیکھتا ہوں اور کبھی رضوان اللہ کے قول کی طرف۔ کس کی بات مانوں اور کس کی نہ مانوں۔

صاحب مضمون لکھتے ہیں کہ محاورے کے بعض دیگر معنوں کے علاوہ یہ بھی ایک معنی ہیں۔ محترم محاورے کے بس یہی معنی ہیں اور کوئی معنی ہو نہیں سکتے۔ اس سے کفالت کا مفہوم ابھرتا ہے نہ کہ سربراہی کا۔ عربی میں 'قَوام' اس مال کو کہتے ہیں جس سے ضروریات پوری ہوں۔ اور 'قِوام' اتنی روزی کو کہتے ہیں جو انسان کو کھڑا کر سکے۔ ایک اور عربی محاورہ ہے۔ 'فلان قِوام اهل بیته'۔ ''فلاں شخص اپنے گھر والوں کی ضروریات کو پورا کرنے والا ہے۔'' قرآن حکیم میں اللہ کا ارشاد ہے:

لَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَكُمُ الَّتِىۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ قِيٰمًا. (النساء۴:۵)	''بے عقلوں کو ان کا مال جسے اللہ نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا، مت دو۔''

عزیزم! کان کو ایک طرف سے پکڑو یا دوسری طرف سے 'قوّامون علی' کے معنی کفیل ہی بنتے ہیں نہ کہ سربراہ۔

میں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ابن فارس نے ''معجم المقاییس'' میں لکھا ہے کہ قیام کی دو قسمیں ہیں قیام حتم یعنی سیدھا کھڑا ہونا اور قیام عزم یعنی کسی کام کا ذمہ لینا۔ آیت زیر بحث میں قیام حتم مراد نہیں جیسا کہ شاونزم کے حامی سمجھتے ہیں کہ مرد عورتوں کے اوپر کھڑے ہونے والے ہیں۔ یہ معنی مضحکہ خیز ہیں۔ مراد قیام عزم ہے یعنی ان کے ذمہ دار ہیں۔

ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی کہ صاحب مضمون کفالت کو نہ ماننے پر بضد ہیں، مگر خلق خدا کے خوف سے حاکم کا لفظ استعمال کرنے سے جھجکتے ہیں۔ اس کی جگہ سربراہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرے عزیز، شیکسپیئر کا قول ہے (What is in a name) نام میں کیا پڑا ہے۔ گلاب کا کوئی بھی نام رکھ دیں خوشبو تو اس سے آئے گی۔ حاکم اور متسلط کی جگہ سربراہ کہیں گے تو حاکمیت کی بو تو اس سے نکلے گی۔ میرے خیال میں آپ کے زعم کے مطابق مولانا اصلاحی کا لفظ

''سرپرست'' سربراہ سے زیادہ بہتر ہے، کیونکہ وہ کفالت کے زیادہ قریب ہے ویسے وہ مفسر تو قابل تعریف ہیں جو برملا وہی بات کہتے ہیں جو ان کے ضمیر کے اندر ہے۔ خلق خدا کے خوف سے ایسی بات کو چھپانا جو آپ کے نزدیک حق ہے کتمان حق کے زمرے میں آتا ہے۔ قرآن میں کتمان حق کی کیا سزا ہے یہ آپ جانتے ہی ہوں گے؟

یہاں پر صاحب مضمون نے دو غیر منطقی اعتراض جڑ دیے ہیں۔ ایک یہ کہ اہل لغت 'قوّامون علی' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے 'مأنہا' (اس نے روزی مہیا کی) کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ 'قام بشانہا' کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ میں نے یہ جملہ صرف ''تاج العروس'' میں 'مأنہا' کے فوراً بعد لکھا دیکھا ہے۔ جس کے معنی ہیں ''اس نے عورت کے کام کا ذمہ اٹھایا۔'' اس اعتبار سے یہ 'مأنہا' کی تشریح ہے۔ میں نے اوپر واضح کر دیا ہے کہ 'قام الرجل علی المرأۃ' کے محاورے کے صرف ایک معنی ہیں۔ دوسرے احتمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے انھوں نے یہ کہا ہے کہ یہ جملہ کیونکہ وہ اپنے مال میں سے خرچ کرتے ہیں، اس بات کی نفی کرتا ہے کہ 'قوّامون علی' کے معنی مال خرچ کرنا ہو۔ سبحان اللہ کیا منطق بگھاری ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ تکرار کا ظاہرہ قرآن حکیم کا ایک اسلوب ہے۔ زیر بحث جملہ میں اس اجمال کی تفصیل ہے جو روزی مہیا کرنے کے معنوں میں پائی جاتی ہے۔ 'و بما انفقوا من اموالھم' میں بتایا گیا ہے کہ مرد عورت کے نان ونفقہ کے علاوہ حق مہر، رہایش اور لباس پر خرچ کرنے کے ذمہ دار بھی ہیں۔ اس کی وضاحت اس وقت ہوگی جب میں 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض' پر بحث کروں گا۔ ''عورتیں شوہر کی وفادار ہوتی ہیں'' اس جملہ کے تحت حاشیہ میں صاحب مضمون نے عورت کے نشوز سے بھی استدلال کیا ہے کہ مرد کو سزا دینے کا حق ہے۔ میں صاحب مضمون کی توجہ 'وان امرأۃ خافت من بعلھا نشوزا' (۴: ۱۲۸) کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ نشوز کا ارتکاب عورت سے بھی ہوتا ہے اور مرد سے بھی۔ اللہ نے عورت کو اجازت دی ہے کہ یا تو وہ شوہر سے صلح کر لے یا اس سے جان چھڑا لے خواہ اس کے لیے اسے خاوند کا منہ پیسے سے بند کرنا پڑے۔

۳۔ تیسرا اعتراض صاحب مضمون نے 'بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض' (اس لیے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے) اور اس کے فوراً بعد 'و بما انفقوا من اموالھم' (کیونکہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں)؟ صاحب مضمون کے ذہن میں کیونکہ مرد کی جنسی بالاتری کا مخصوص خیال ہے اس لیے وہ بات سمجھنے کے بجائے سبب اور مسبب اور واو عطف کی آڑ لے رہے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اللہ کا قول ہے مرد عورتوں کے کفیل ہیں اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ ان کو ایک دوسرے پر

فضیلت حاصل ہے۔ جو مفسر 'قوّامون علی' کا ترجمہ حاکم یا متسلط کرتے ہیں ان کو اس جملے سے مشکل یہ پیش آتی ہے کہ یہ جملہ ان کے ترجمہ کی نفی کرتا ہے۔ اگر بعض باتوں میں عورتوں کی فضیلت کو مان لیا جائے تو حاکم کا تصور خاک میں مل جاتا ہے۔ اس لیے اپنے خیال کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس جملہ کی تاویل یہ کی گئی کہ پہلے 'بعضھم' سے مراد مرد اور دوسرے 'بعضھم' سے مراد عورتیں ہیں اور ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اس لیے وہ حاکم ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ قطعی غلط ہے اور سیاق وسباق سے کٹا ہوا ہے۔ صاحب مضمون بھی اسی خیال کے ہم نوا ہیں۔ وہ مرد کی خلقی فضیلت کے قائل ہیں اور ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ٹکڑے سے مرد کی مطلق فضیلت کی نفی ہوتی ہے۔ اس ٹکڑے سے جس طرح مرد کی مطلق فضیلت کی نفی ہوتی ہے بالکل اسی طرح حاکم، متسلط اور سربراہ کے ترجمہ کی بھی نفی ہوتی ہے۔

یہ ایک گھر گرہستی کا نظام ہے جس میں خالق کائنات نے توازن رکھا ہے۔ بعض باتوں میں میاں کی صلاحیت زیادہ ہے اور بعض باتوں میں بیویوں کی۔ مرد میں کمانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس کے پاس وقت بھی زیادہ ہوتا ہے اور مواقع بھی۔ اس کے مقابلہ میں اللہ نے عورت کو تخلیقی قوت عطا کی ہے۔ اس میں حمل، ولادت، رضاعت اور تربیت کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اس لیے کہ اس کے پاس وقت بھی کم ہوتا ہے اور مواقع بھی کم۔ علامہ رشید رضا نے اپنے استاذ محمد عبدہ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے مرد اور عورت کی استعداد کے مطابق بوجھ ڈال کر حساب برابر کر دیا ہے۔ اب آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ میاں بیویوں کے 'قوّام' (کفیل) ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے اور دوسرا سبب جو اس فضیلت کا نتیجہ ہے یہ ہے کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی مالی کفالت کو وجہ فضیلت قرار دیا ہے۔ سید قطب اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں ''یہ ایک خاندانی نظام ہے اس میں شریک مرد اور عورت مستقل شخصیت کے مالک ہیں۔ دونوں کے حقوق یکساں ہیں۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے 'کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ' میاں بھی راعی (نگران) اور بیوی بھی، دونوں جواب دہ ہیں۔ میں نے اپنے مضمون میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مسلک کا ذکر کیا ہے کہ اگر میاں نان ونفقہ کی ادائیگی سے عاجز ہو تو وہ قوامیت کا حق کھو دیتا ہے اور بیوی اس بنیاد پر اس سے اپنی جان چھڑوا سکتی ہے۔

ہمارے گھروں میں کام کرنے والی بے شمار بچیوں کے شوہر یا باپ نشہ کرتے ہیں اور ان کی کمائی کھاتے ہیں کیا وہ پھر بھی سربراہ کہلائیں گے؟

فضیلت کی اس بحث کے آخر میں صاحب مضمون نے وہی بات کہہ دی ہے جو میں کہہ رہا ہوں یہ کہ 'بعضھم علی بعض' کی ترکیب سے مرد کی مطلق فضیلت کا احتمال ختم ہو گیا ہے۔ یہی بات تو میں کہہ رہا ہوں پھر بحث کس بات کی؟

۴۔ چوتھا اعتراض لفظ قنوت کی لغوی بحث کے بارے میں ہے۔ وہ یہ بحث نہ کرتے تو بہتر ہوتا، کیونکہ اس سے ان کی لغت دانی کا پول کھل گیا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں اس لفظ کے ضمن میں ابن فارس اور امام راغب جیسے جغادری اہل لغت کا حوالہ دیا ہے۔ ان کے مقابلہ میں رضوان اللہ صاحب نے اپنے آپ کو بطور اصمعی دوراں پیش کیا ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ ابن فارس ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھتے ہیں کہ 'قنت' صرف اور صرف دین کے بارے میں اطاعت پر دلالت کرتا ہے۔ دین کے راستے میں استقامت کو قنوت کہا گیا ہے۔ نماز میں طول قیام اور سکوت کو بھی قنوت کہتے ہیں۔ ''مفردات'' میں امام راغب نے قنوت کے معنی خشوع اور اطاعت میں التزام کے کیے ہیں، یعنی خشوع و خضوع اور دوام اطاعت کے عناصر ہیں۔ جس اطاعت میں یہ عناصر مفقود ہوں گے اسے قنوت نہیں کہا جا سکتا۔ قرآن کی آیات ۲:۲۱۶، ۲۳۸، ۳۰:۲۶ اور ۳۳:۴۱ میں سے کسی آیت میں بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کے سوا کسی انسان کی اطاعت کے لیے یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ صاحب مضمون نے لکھا ہے کہ اس لفظ کے عام ہونے کی شہادت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اس کے لیے نہ کسی عربی محاورہ کا حوالہ دیا ہے اور نہ کسی شعر اور نہ کسی لغت کا۔ آخر یہ شہادت کہاں پائی جاتی ہے؟ لکھتے ہیں اہل زبان کا محاورہ ہے 'قنتت المرأۃ لزوجھا'۔ یہ محاورہ کہاں ہے کچھ تو بتائیں۔ اسی محاورے کی وجہ سے میں نے ان کو اصمعی دوراں کا لقب دیا ہے۔ بیس برس تک میں ریاض سعودی عرب میں رہا۔ اہل نجد کے علاقہ کی زبان معروف ہے۔ میرے رفیق کار نجد کے سعودی، مصری، فلسطینی اور شامی تھے۔ میں نے کبھی کسی کے منہ سے یہ محاورہ نہیں سنا۔ ہاں پنجاب کا ایک نو آمیز جس کی شناسائی عربی زبان سے واجبی سی ہے وہ کہہ رہا ہے کہ اہل زبان کا محاورہ ہے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہ آیات میں نے پیش کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ اور کون سی شرعی دلیل کی ضرورت ہے۔

صاحب مضمون کی بحث کا معیار یہ ہے کہ دیدہ دلیری سے دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہ لفظ میاں کی اطاعت کے لیے بے تکلف استعمال ہوتا ہے اور ثبوت میں ایک خود ساختہ محاورہ بغیر کسی حوالے کے دے دیا ہے۔ گویا وہ کہہ رہے ہیں

چھوڑو قرآن کو، رہنے دو ابن فارس اور امام راغب کو میرے قول کی طرف دھیان دو، کیونکہ میں نے برسہا برس تک صحرانوردی کر کے صحرانشینوں سے عربی محاورہ اخذ کیا ہے۔

مضمون نگار کے ذہن میں ایک ہی سودا سمایا ہوا ہے کہ ثابت کیا جائے کہ نیک عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے شوہر کی فرماں بردار ہو۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے وہ کبھی سبب اور مسبب کی اور کبھی متعلق اور غیر متعلق کی لایعنی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔

آیت کے جس حصے کو انھوں نے تختۂ مشق بنایا ہے وہ یوں ہے: 'فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ' ''پس جو نیک عورتیں ہیں وہ فرماں برداری کرنے والیاں، رازوں کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں بوجہ اس کے اللہ نے بھی ان کی یا رازوں کی حفاظت فرمائی ہے۔'' امام رازی نے اس ٹکڑے کا خوب صورت ترجمہ کیا ہے ''یعنی وہ اللہ کی اطاعت کرنے والیاں اور پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں ہیں۔'' اللہ کے حقوق کو مقدم رکھا گیا ہے پھر اس کے بعد زوج کے حقوق کو بیان کیا گیا ہے اور زوج کے حقوق کی حفاظت ان پر واجب کی گئی ہے، کیونکہ اللہ نے ان کے حقوق کو بھی زوج پر واجب کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ محاورے میں کہا جاتا ہے 'هذا بذاك' ''یہ اس کے مقابلہ میں ہے۔'' یہ عبارت امام رازی کی ہے جو انھوں نے زیر بحث ٹکڑے کے ضمن میں ''تفسیر کبیر'' میں لکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ مضمون نگار کی تسلی ہو جائے گی۔

مضمون نگار مجھے ایک سوال کا جواب دیں: 'کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیک عورتیں وہ ہوتی ہیں جو شوہر کی فرماں بردار ہوں؟' کیا وہ عورت جو لچے لفنگے شوہر کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے وہ صالح ہو سکتی ہے، ہاں جو عورت اللہ کی فرماں بردار ہو گی وہ اپنے شوہر کا صرف جائز حکم مانے گی کیونکہ 'لا طاعة فی معصية الخالق' اللہ کی نافرمانی میں وہ کسی کا حکم نہیں مانے گی۔ اطاعت صرف اللہ کی ہو گی اس لیے یہاں پر وہ لفظ استعمال ہوا ہے جو صرف اللہ کی اطاعت کے ساتھ مخصوص ہے۔

صالحات کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ اللہ کی فرماں بردار ہوتی ہیں۔ صلاح وتقویٰ کے باعث یہ ان کی فطرت بن جاتی ہے کہ وہ اللہ کی حکم عدولی نہیں کرتیں اور پیٹھ پیچھے بندوں کے حقوق کی بھی حفاظت کرتی ہیں، کیونکہ اللہ ان کی مراقبت کرتا ہے اور ان کو خباثت سے بچائے رکھتا ہے۔ بعض مرد تو بیوی کو خود خیانت پر آمادہ کرتے ہیں مگر جو صالحات اللہ کی فرماں بردار ہوتی ہیں وہ خیانت سے بچ جاتی ہیں۔ غیب یا راز کی حفاظت وہ اپنی فطرت ثانیہ کی وجہ سے کرتی ہیں نہ کہ مرد کو خوش کرنے کے لیے۔ اللہ نے یہ ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ ایسی صالح عورتیں گھر کو ٹھیک طریقے سے چلانے

کی اہل ہوتی ہیں اس میں مرد کی فضیلت یا برتری کا کوئی شائبہ نہیں جیسا کہ صاحب مضمون کا وہم ہے۔

'الغیب' سے مراد راز مولانا اصلاحی نے لیا ہے۔ وہ پیٹھ پیچھے کی اصطلاح کو مناسب نہیں سمجھتے۔ مذکورہ تمام صفات عورتوں کے ساتھ خاص نہیں کہ وہ صرف مرد کی تابع داری کرتی رہیں اور مرد ان پر حکم چلاتا رہے۔ اللہ کی فرماں برداری اور رازوں کی حفاظت مردوں سے بھی مطلوب ہے۔ جتنی یہ عورتوں پر واجب ہیں مردوں پر بھی اتنی ہی واجب ہیں 'الحافظین فروجھم و الحافظات' کی ترکیب مردوں اور عورتوں کے لیے قرآن حکیم میں استعمال ہوئی ہے۔

اگر ہم اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ یہ کفالت گھر کے اندر تقسیم کار کا ایک نظام ہے تو آیۂ مبارکہ بڑی آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے۔ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں ہم مرد کی فضیلت کا قضیہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ صاحب مضمون کی سوئی بھی اسی فضیلت پر اٹکی ہوئی ہے۔

مضمون کے آخر میں صاحب مضمون نے ایک لمبا چوڑا بیان اپنے موقف کی تائید میں داغ دیا ہے۔ کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ گھر کا جو سربراہ سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہو گا وہ ظالم ہو گا۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی نظام کا سربراہ عادل ہو گا۔ کاش یہ نظام قائم ہو جائے۔ وگرنہ خلافت راشدہ کے بعد آج تک یہ نظام قائم نہ ہو سکا۔ بعد کے زمانہ کے سربراہ نظام خلافت کی پیداوار تھے۔ انھوں نے کیا کیا گل نہیں کھلائے؟ اپنے حرم میں لونڈیوں کو بھر کر عورت کو رسوا کیا گیا۔ رامش و رنگ کی محفلوں میں انھیں اپنی شہوت پرستی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کی منڈیاں لگائی گئیں۔

دوسرے صاحب مضمون نے عورت اور مرد کے درمیان مساوات پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ میرے عزیز! یہ مساوات قرآن نے قائم کی ہے۔ قرآن نے عورت کو انسان سمجھ کر مرد کے مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔ آپ نے اپنے مضمون میں 'للرجال علیھن درجة' (۲:۲۲۸) کا ذکر کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ مرد اور عورت کی باہمی فضیلت پر ایک مضمون لکھیں۔ اس کا جواب میں دوں گا اور بتاؤں گا کہ یہ درجہ فضیلت کا نہیں ذمہ داری کا ہے۔ امام ابن جریر طبری کا یہی قول ہے۔

میرا ایک مشورہ ہے کہ آیندہ بحث میں علمی انداز اختیار کرتے ہوئے حوالہ ضرور دیا کریں۔ ورنہ بحث بے وقعت ہو جاتی ہے۔

ریحان احمد یوسفی

بیچ کی نماز

قرآن کریم کی سورۂ بقرہ (۲: ۲۳۸) میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اپنی نمازوں اور خصوصاً بیچ کی نماز کی حفاظت کریں۔ نمازیں پانچ ہوتی ہیں، اس اعتبار سے بیچ کی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے جو پانچ نمازوں کے وسط میں آتی ہے۔ نماز عصر سے متعلق اس خصوصی ہدایت کا ایک خاص پس منظر ہے جس کا اندازہ آج کل کے لوگوں کو نہیں ہوسکتا۔

انیسویں صدی تک انسانی بستیاں، بجلی نہ ہونے کی بنا پر آج کل کے دور کی طرح روشن نہ ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں یہ ناگزیر تھا کہ کاروبار زندگی سر شام ہی بند کر دیا جائے تاکہ سورج کی روشنی ہی میں لوگ اپنے معاملات نمٹا کر گھروں کو لوٹ سکیں۔ ایسے میں زمانۂ قدیم کی خاموش اور سست رفتار زندگی میں عصر کا وقت بڑی مصروفیت اور تیزی کا وقت ہوا کرتا تھا۔ اس وقت میں سورج بھی اسی تیزی سے ڈھلا کرتا ہے۔ چنانچہ اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ بازار کی چہل پہل اور خرید و فروخت کی ہنگامہ آرائی میں لوگ نماز عصر کو فراموش کر دیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر لوگوں کی توجہ اس نماز کی طرف مبذول کرائی۔

دور جدید میں ایک دوسرے پہلو سے اب یہ توجہ فجر کی نماز کی طرف دلانے کی ضرورت ہے۔ آج کل کی زندگی میں دیر رات کو سونا معمولات زندگی میں شامل ہو چکا ہے۔ دوسری طرف زمانۂ قدیم کی طرح کاروبار حیات علی الصبح شروع نہیں ہوتا، بلکہ اسکول، کاروبار اور دفاتر سب سورج نکلنے کے کافی دیر بعد شروع ہوتے ہیں۔ چنانچہ دیر سے سونے والوں کے لیے نہ صرف فجر کے اندھیرے میں اٹھنا مشکل ہے، بلکہ نماز کے بعد دوبارہ سونا بھی ایک ضرورت بن گیا ہے۔ ان حالات میں فجر کی نماز پڑھنا بہت مشکل کام بن گیا ہے اور عملاً فجر پڑھنا تہجد پڑھنے جیسا عمل بن چکا

ہے۔

ایسے میں اہمیت، فضائل اور اجر، تمام پہلوؤں سے فجر کی نماز سب سے بڑی نماز بن چکی ہے۔اس کا اہتمام بلاشبہ ایک نمازی کی معراج ہے۔

ایمان کا فیصلہ

ہجرت مدینہ کے بعد مسلمان جب مدینہ آئے تو سولہ سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔اس کے بعد جنگ بدر سے دو ماہ قبل یہ حکم نازل ہوا کہ اب مسلمان ہر نماز میں اپنا رخ بیت اللہ الحرام کی طرف کرلیا کریں۔ یہ حکم سورۂ بقرہ کی آیات (۱۴۲-۱۵۰) میں آیا ہے۔ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ان کے پیش نظر یہ تھا ہی نہیں کہ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ بنے۔لیکن تبدیلئ قبلہ کا حکم ہجرت مدینہ کے فوراً نہیں دیا گیا بلکہ کچھ عرصہ بعد دیا گیا، مقصود اس سے یہ جانچنا تھا کہ یہود میں سے جو لوگ ساتھ ہو گئے تھے ان کے بارے میں واضح ہو جائے کہ کون اللہ اور رسول کا سچا وفادار ہے اور کس کو اپنے آبا کا طریقہ پیارا ہے، (۲:۱۴۳)۔ وہ اگر سچے مومن ہیں تو آبائی قبلہ بدلنے کے باوجود وفادار رہیں گے۔

مذہبی لوگ ہمیشہ خدا کے نام پر دنیا کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ ان کی وفاداری کا رخ اپنے اسلاف، اپنی قوم اور اپنی تہذیب کی طرف مڑتا چلا جاتا ہے۔وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی ساری دعوتی جدوجہد اللہ کے دین کے لیے ہو رہی ہے، لیکن درحقیقت وہ اپنے خاص فرقہ اور خیالات کی تبلیغ کی جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ فلاں حکم شریعت کا ہے، لیکن درحقیقت وہ ان کے اپنے خاص فقہی مذہب اور مسلک کا فہم ہوتا ہے۔

ایسے میں اللہ تعالیٰ امتحان کی کوئی نہ کوئی شکل پیدا کر دیتے ہیں، جس کے بعد ایسے دین داروں کی قلعی کھل جاتی ہے۔کوئی مرد قلندر اٹھتا ہے دلیل کی بنیاد پر دعوت حق ان کے سامنے رکھ دیتا ہے، مگر یہ لوگ حق کے بجائے اپنے فرقہ اور نقطۂ نظر کو بنیاد بنا لیتے ہیں۔ وہ دلیل کے بجائے جذبات اور اصول کے بجائے تعصب پر فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کا فیصلہ کرتا ہے، مگر وہ اس سے بے خبر اپنی دین داری کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔

کیسا عجیب ہے خدا کا یہ امتحان اور کیسی عجیب ہے اس کے نام پر کھڑے ہوئے لوگوں کی ناکامی۔

قیادت کا مسئلہ

ہمارے ہاں اکثر اس بات کا شکوہ کیا جاتا ہے کہ مخلص اور باشعور قیادت کا فقدان ہو چکا ہے۔ اب نہ اقبال جیسے فکری رہنما پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ شاہ ولی اللہ جیسے مذہبی عالم، نہ قائداعظم جیسے سیاسی لیڈر کی اب کوئی جگہ ہے اور نہ سرسید جیسے مصلح کے اٹھنے کا کوئی امکان۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اللہ تعالیٰ کے قانون کے قطعاً خلاف ہے۔

خدا نے جب سے انسان کو اس دنیا میں بسایا ہے تب سے اس کی انفرادی اور اجتماعی ضرورت کی ہر چیز کی فراہمی کی ذمہ داری خود لے رکھی ہے۔ انسانی ضروریات ہوا، پانی، خوراک ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ لوگ مختلف صلاحیتیں لے کر پیدا ہوں تاکہ اجتماعی زندگی وجود میں آسکے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ محنت، سرمایہ، عقل اور علم کا بہترین استعمال کرنے والے لوگ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک طرح کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو قوم کی قیادت اور رہنمائی کا کام کرتے ہیں۔

ہماری قوم میں بھی اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے تحت اعلیٰ ترین درجے کے لیڈر پیدا ہوتے رہے ہیں اور آج تک ہو رہے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں لیڈر نہیں پیدا ہوتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لیڈر تو موجود ہیں، ہم ان کی بات سننے، ان کی رہنمائی قبول کرنے اور ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ خاص کر ہمارا مڈل کلاس طبقہ جس نے مادی آسایشوں کو زندگی کا نصب العین بنالیا ہے، وہ اپنا کردار ادا نہیں کر رہا۔

ہم اپنے بچوں میں اجتماعی خیر و شر کا شعور پیدا کرنے کے بجائے فلموں اور میوزک کا ذوق پیدا کرتے ہیں۔ ہم انھیں اپنے مذہب اور تہذیب کا شعور دینے کے بجائے منہ بگاڑ کے انگریزی بولنا سکھانا پسند کرتے ہیں۔ ہم کتاب خریدنے کے بجائے برگر خریدنا، مطالعے کے بجائے ٹی وی پر تفریحی پروگرام دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہم مخلص اور باکردار لوگوں کا ساتھ دینے کے بجائے اپنے گھر اور کیریئر کو مقصودِ زندگی بنانا پسند کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمیں شکوہ اپنے آپ سے ہونا چاہیے نہ کہ ملک کے بد سے بدتر ہوتے ہوئے حالات سے۔

غداری

اردو زبان میں میر جعفر غداری کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ادب اور تاریخ میں اس کی غداری ضرب المثل بن چکی ہے۔ ہمارے ہاں یہ عام تصور ہے کہ ۱۷۵۷ کی جنگ پلاسی میں اگر میر جعفر غداری نہ کرتا تو انگریز کبھی ہندوستان پر قبضہ نہ کر سکتے۔ بدقسمتی سے یہ بات جو ہمارے لیے ایک تاریخی مسلمہ بن چکی ہے، درحقیقت اپنی غلطیوں اور تاریخی حقائق سے نظریں چرانے کے مترادف ہے۔ جنگ پلاسی کے حقائق میر جعفر کی غداری کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ پلاسی دور جدید کی اہم ترین جنگ تھی۔ اس نے ایک طرف انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ کی راہ ہموار کی اور دوسری طرف یہاں سے حاصل ہونے والے خزانے جب انگلستان پہنچے تو ٹیکنالوجی کی ترقی کو سرمایہ کی وہ طاقت حاصل ہوگئی جس نے یورپ میں صنعتی انقلاب برپا کر دیا۔ تمام اہم مورخین یہ بات مانتے ہیں کہ ۱۷۶۰ سے ۱۷۸۰ وہ زمانہ ہے جب انسانی ہاتھ اور حیوانی قوت کی جگہ مشینی طاقت نے لی اور دیکھتے ہی دیکھتے صنعتی انقلاب کی لہر نے مغرب کو دنیا کا حکمران بنا دیا۔ تاہم اس تاریخی جنگ میں انگریزوں کی کامیابی کے عوامل 'میر جعفر' کے علاوہ اور بھی بہت تھے۔

پہلا عامل مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کی علم سے غفلت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس خطے کو غیر معمولی خزانوں سے نوازا تھا۔ مگر بدقسمتی سے مغلیہ حکمران جنھیں صدیوں یہاں حکومت کا موقع ملا ان کا پسندیدہ شوق مقبرے، مساجد، باغات اور دیگر یادگاریں تعمیر کرنا تھا۔ ان کے عہد میں یورپی سفیر اور تاجر آ آ کر انھیں بتا رہے تھے کہ دنیا میں کیا تبدیلی آ رہی ہے، مگر ان کی آنکھوں پر ڈلا ہوا پردہ نہ اٹھ سکا۔ وہ علم و فن کی کوئی درس گاہ قائم نہ کر سکے۔ وہ کتب خانے اور چھاپہ خانے کھولنے کو کرنے کا کوئی کام نہ سمجھ سکے۔ وہ جدید علوم کے ترجمے اور تصانیف کی اہمیت نہ سمجھ سکے۔ انھوں نے اپنی بحری قوت کو بڑھایا، نہ اسلحہ و بارود کو جدید سے جدید تر بنانے کی کوئی کوشش کی۔

چنانچہ آخری عظیم مغل حکمران اورنگزیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷) کے صرف نصف صدی بعد پلاسی کا معرکہ ہوا۔ سراج الدولہ کی ۵۰ ہزار فوج کے سامنے رابرٹ کلائیو کی صرف ۲۹۱۷ افراد پر مشتمل فوج تھی۔ مگر یہ فوج جدید اصولوں پر تربیت یافتہ تھی۔ جبکہ سراج الدولہ کی فوج غیر تربیت یافتہ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو میر جعفر کے زیر قیادت دستوں کو الگ ہوتا دیکھ کر سراسیمہ ہوگیا۔ نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا۔

علمی پسماندگی کی تاریخ کے ساتھ دوسرا بڑا عامل صدیوں سے اخلاقی انحطاط تھا۔ یہ انحطاط اگر ایک طرف میر جعفر کی غداری کی شکل میں ظاہر ہوا تو دوسری طرف سراج الدولہ کی اپنی سیرت میں بھی موجود تھا۔ ابتدائی عمر سے اس کی شہرت ایک ظالم اور متکبر شخص کی تھی جس کے پاس دولت کے انبار تھے۔ یہ انبار یورپ پہنچے تو صنعتی انقلاب لے آئے مگر نواب کا خزانہ کبھی بنگال کے غریب عوام کی بہبود کے لیے نہ صرف ہوسکا۔

ایک اور اہم عامل انسانی سماج میں ہونے والی ترقی اور جمہوری اقدار سے ہماری ناواقفیت تھی۔ اٹھارہویں صدی میں امریکہ اور یورپ میں جمہوریت کا پودا ایک تناور درخت بن چکا تھا اور ہمارے ہاں حال یہ تھا کہ سراج الدولہ کے نانا علی وردی خان نے بیٹا نہ ہونے کی بنا پر اپنے نواسے ۲۳ سالہ ناتجربہ کار اور نااہل سراج الدولہ کو تخت نشین کر دیا۔ دربار کے امرا اور خاندان کے لوگوں نے اس فیصلے کو دل سے پسند نہیں کیا تھا۔ چنانچہ سازشیں شروع ہو گئیں۔ اس صورت حال میں سراج الدولہ کی نااہلی نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میر جعفر اس سے قبل علی وردی خان کے ساتھ غداری کر چکا ہے پھر بھی اس نے اس کو اپنی افواج کا سربراہ بنا دیا۔ پلاسی سے پہلے بھی میر جعفر کی انگریزوں سے ساز باز سراج الدولہ کے علم میں تھی۔ مگر اس نے میر جعفر کا عہدہ کم کرنے ہی پر اکتفا کیا۔ نہ اسے سزا دی نہ فوج سے معزول کیا۔ چنانچہ عین میدان جنگ میں اس کے ماتحت جتنی فوج تھی وہ اسے لے کر الگ ہو گیا۔ اس لیے میر جعفر نے جو کچھ کیا اس میں سراج الدولہ برابر کا ذمہ دار ہے۔ ایسے نااہل حکمرانوں کی تخت نشینی، غیر جمہوری طرز حکمرانی کے لازمی نتائج میں سے ہے۔

پلاسی میں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری جتنی میر جعفر پر عائد ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ علم و اخلاق میں ہماری پستی اور جمہوری رویے سے ہماری غفلت پر عائد ہوتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہم نے پچھلی ڈھائی صدیوں سے ان حقائق سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اور ہر شکست کا انجام کسی میر جعفر پر ڈال دیتے ہیں۔ ہماری نفسیات میں یہ بات شامل ہو چکی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کا اقرار کرنے اور غلطیوں کو ماننے کے بجائے اپنی شکستوں کا الزام کسی غدار پر ڈال دیتے ہیں اور اس پر تبراء بھیج کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یوں کبھی ہم میں احتساب کا وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا جو قوموں کی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

تصور کیجیے کہ ہمارے نصاب کی کتابوں میں یہ لکھا ہوتا کہ پلاسی میں شکست علم و اخلاق میں پستی اور غیر جمہوری سوچ کے باعث ہوئی تو لوگوں کی سوچ کتنی بدلتی۔ مگر چونکہ شکست کی وجہ میر جعفر کو قرار دے دیا گیا اس لیے آج پلاسی کے ڈھائی صدی بعد بھی ہماری جمہوری پارٹیوں میں خاندانی بادشاہی کا راج ہے اور اس کے باوجود ہم اپنے

ووٹوں سے انھی رہنماؤں کو منتخب کرتے ہیں۔سرسید کی مہربانی سے ہم علمی طور پر مغلیہ عہد سے تو باہر آ گئے مگر ترقی یافتہ اقوام کے ہم پلہ آج تک نہیں ہو سکے۔اور اخلاقی دیوالیہ پن کا تو نہ پوچھیے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

تاریخ اس دنیا میں انسانوں کی سب سے بڑی استاد ہے۔لیکن اس سے سبق وہی لوگ سیکھ سکتے ہیں جو تاریخ کو درست زاویے سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔جو لوگ تاریخ کے آئینے میں صرف اپنی پسند کی باتیں تلاش کریں، وہ کبھی تاریخ سے سیکھ کر ترقی نہیں کر سکتے۔

اندھیرا چھٹ جائے گا

اقوام عالم کی ہزارہا برس کی تاریخ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ قوموں کی تقدیر کا فیصلہ ان کو پیش آنے والے اچھے برے حالات نہیں کرتے، بلکہ وہ فکری قیادت کرتی ہے جو ان کو زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی اور ان کے لیے راہ عمل طے کرتی ہے۔کسی قوم کے حالات بہت برے ہوں اور اس کے فکری رہنما بہت مثبت سوچ کے حامل ہوں تو قوم بدترین بحرانوں سے بھی نکل آتی ہے، اس کے برعکس قوم کے حالات اچھے ہوں، مگر اس کے رہنما منفی سوچ سے اوپر نہ اٹھ سکیں تو بہترین امکانات کی حامل قوم بھی بربادی کا شکار ہو جاتی ہے۔

تاریخ کے اس سبق کی سب سے نمایاں مثال خود پاکستان ہے۔ایک صدی قبل اس خطے کے مسلمان غلامی، محرومی، پستی اور ذلت کا شکار تھے۔پورا عالم اسلام ایک ایسی سیاسی، ذہنی اور معاشی غلامی کا شکار تھا جس سے نکلنے کے امکانات دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔مگر ایسے میں سرسید اور علامہ اقبال جیسے عظیم لوگ پیدا ہوئے۔ان دونوں کی مشترکہ خصوصیت یہ تھی کہ بدترین حالات کے باوجود انھوں نے امید کے دیے روشن کیے اور اس وقت کے حالات میں ممکنہ طور پر ایک بہترین لائحۂ عمل کی طرف قوم کی رہنمائی کی۔نتیجہ یہ نکلا کہ صرف نصف صدی میں دنیا کی پانچویں اور مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست ظہور پذیر ہوئی۔

بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد سے ہم مسلسل تنزل کا شکار ہیں۔یہ زوال کیوں ظہور پذیر ہوا، سر دست اس کو جانے دیجیے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ اب ہم اس زوال کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔اس زوال کے باوجود ہمارے آج کے حالات ایک صدی پہلے کے حالات سے بہت بہتر ہیں۔بلاشبہ آج ہم ایک بدترین جمہوری دور سے گزر رہے ہیں،

لیکن ہم نے یہ جان لیا ہے کہ بدترین جمہوریت بہترین آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔ سیاسی، معاشی اور قومی سلامتی کے اعتبار سے ہمیں سخت حالات کا سامنا ہے، لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ ادراک ہو چکا ہے کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔ یہ ادراک کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ جس قوم کے اعلیٰ اذہان میں یہ شعور پیدا ہو جائے وہ چند برسوں میں حالات کا رخ اپنے حق میں پھیر دیتے ہیں۔

آج پاکستانی قوم اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہی ہے۔ اس جنگ میں ہم نے حال ہی میں آمریت کو شکست دی ہے، مگر جمہوری رہنماؤں کی عاقبت نااندیشی کے ہاتھوں وقتی شکست کھائی ہے۔ قوموں کی زندگی میں وقتی پسپائی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ہم اس وقت عارضی پسپائی کا سامنا کر رہے ہیں۔ مگر چند برسوں کے اندر لازماً ہم بہتری کی طرف جائیں گے۔

اس وقت کرنے کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم اقبال اور سرسید کی رہنمائی کو زندہ کریں۔ سرسید نے تعلیم کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب سارے امکانات ختم نظر آتے تھے انھوں نے علم کے میدان کو قوم کے سامنے رکھا اور کچھ ہی عرصے میں قوم کے بہترین لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کی لگن پھونک دی۔ جس کے نتیجے میں آنے والے چند برسوں میں اعلیٰ ترین رہنماؤں کی ایک کھیپ سامنے آ گئی۔

اقبال نے مایوسی اور بے یقینی کی شکار قوم میں امید کا دیا جگایا اور اس کے افراد میں یقین اور اعتماد کی طاقت پیدا کر دی۔ قوم کے حال پر چھائی شکست کی تلافی کے لیے اقبال نے قوم کا تعلق اس کے عظیم ماضی سے جوڑا اور اس کے افراد کو یقین دلا دیا کہ وہ اگر حوصلے سے کام لیں تو مستقبل ان کا ہے۔ اس یقین نے قوم میں جرأت اور ہمت کی وہ طوفانی لہر پیدا کی جو آنے والے دنوں میں انگریزوں اور ہندوؤں کی طاقت اور مخالفت کو اپنے زور میں بہا کر لے گئی۔

آج بھی قوم کے باشعور لوگوں کے کرنے کا اگر کوئی کام ہے تو وہ یہی ہے کہ قوم میں تعلیم کا صور پھونکیں اور امید و یقین کی شمع روشن رکھیں۔ بہت جلد ہر اندھیرا چھٹ جائے گا۔

عقیل احمد انجم

دوہرا معیار

موجودہ دور میں اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو ہمیں ایک چیز نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں نے دو پیمانے بنا رکھے ہیں۔ ایک پیمانہ اپنے لیے اور دوسرا پیمانہ دوسروں کے لیے۔ وہ اپنے لیے بہتری کی خواہش رکھتے ہیں اور دوسروں کے لیے برا چاہتے ہیں۔ اپنے لیے تو یہ پسند کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں، لیکن وہ خود دوسروں کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کا خوب خیال رکھیں، لیکن وہ خود دوسرے لوگوں کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں رکھتے اور ان کے ساتھ رواداری اور خندہ پیشانی کے ساتھ بالکل پیش نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں لوٹ کھسوٹ، رشوت، بددیانتی، جھوٹ، فریب اور جعل سازی وغیرہ کی اخلاقی بیماریاں عام ہیں۔ اسلام نے ایک صالح اور پرامن معاشرے کے لیے یکساں رویے کو ضروری قرار دیا ہے اور اسے ایمان کا نمایاں وصف قرار دیا ہے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک وہ دوسروں کے لیے بھی وہی چیز نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' (متفق علیہ)

آج مسلم معاشرہ کا یہی حال ہوگیا ہے۔ مسلمان خود تو چاہتے ہیں کہ انھیں کسی طرح کا نقصان یا گزند نہ پہنچے مگر وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔

جب ہم اپنے لیے نقصان برداشت نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں دوسروں کے نقصان کی بھی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ ایک مثل مشہور ہے کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود گڑھے میں گرتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی شکایت اور برائیاں بیان کرتے ہیں، ہر کس و ناکس کو برا بھلا کہہ دیتے ہیں، دوسروں کی عزت و ناموس کا بالکل خیال نہیں

رکھتے اور ان کی کمزوریاں مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، جبکہ وہی لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ ان کی برائیاں بیان کریں۔ شیخ سعدی نے ایسے موقع کے لیے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

''جو شخص تمھارے سامنے کسی کی برائی کر رہا ہوتا ہے، وہ یقیناً کسی اور کے سامنے تمھاری بھی برائی کرے گا۔''

تین چیزیں معاشرے کی بہتری اور افراد کو زیور اخلاق سے آراستہ کرنے سے یا یوں کہیں کہ حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ غریبوں کو کھانا کھلایا جائے، ان کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا جائے، ان کی مزاج پرسی کی جائے۔ سلام کو عام کیا جائے اور صلۂ رحمی کا رواج ہو، اس لیے کہ اس سے امت آپس میں گھل مل کر رہے گی اور مضبوط بنیاد کی طرح ہوگی۔ چوتھی بات یہ کہی گئی کہ رات کے آخری حصے میں نماز (تہجد) کا اہتمام کرو، تاکہ اللہ سے قربت اور لگاؤ میں اضافہ ہو، ساتھ ہی دیگر امور (عبادات اور معاملات) میں خلوص وللّٰہیت پیدا ہو جائے، جس سے توکل علی اللہ کی کیفیت پیدا ہو۔ آخر میں اس کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ جب تم ایسا کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔ ایک مومن کا رشتہ دوسرے مومن سے بھائی چارگی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مومن کا رشتہ بھی ایسا مضبوط ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے مومن بھائی کی تکلیف کو خود اپنی تکلیف محسوس کرے، اس کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت اس پر ظلم گویا خود اپنے اوپر ظلم تصور کرے اور یہی ایمان کی کیفیت اور اس کا تقاضا ہے۔

قرآن کہتا ہے:

''مومن تو سب بھائی بھائی ہیں۔'' (الحجرات:۱۰)

ایک مسلمان کو اپنی ہی طرح دوسرے مسلمان کی حفاظت کرنی ہے اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہے۔ اس طرز عمل میں بھی خود اس کا فائدہ ہے، کیونکہ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کا خیال رکھے گا۔ اگر وہ دوسروں کا خیال رکھے گا اور اس کی عیب جوئی کے بجاے، پردہ پوشی کرے گا تو خدا بھی اس کی پردہ دری فرمائے گا۔ اگر انسان اپنے اوپر اپنے مسلمان بھائی کو ترجیح دینے لگے گا یا کم از کم اپنی ہی طرح اس کی بھلائی بھی چاہے گا تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر کی بہت سی خرابیاں اور اخلاقی گراوٹیں خود بہ خود ختم ہو جائیں گی۔ ایسا شخص اپنے معاشرے میں چلتا پھرتا عملی نمونہ ہوگا جسے دیکھ کر لوگ بھی اپنے رویے میں تبدیلی لائیں گے جسے اصلاح امت کا کار عظیم سمجھا جائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ تبھی ہوگا جب آپ دہرا معیار اور دو پیمانوں کو چھوڑ کر سب کے لیے یکساں معیار اپنائیں گے۔ جو اپنی اولاد کے لیے یا اپنے گھر والوں کے لیے سوچتے ہیں وہی دوسروں کے لیے سوچیں گے۔